آثار ابوالکلام آزاد

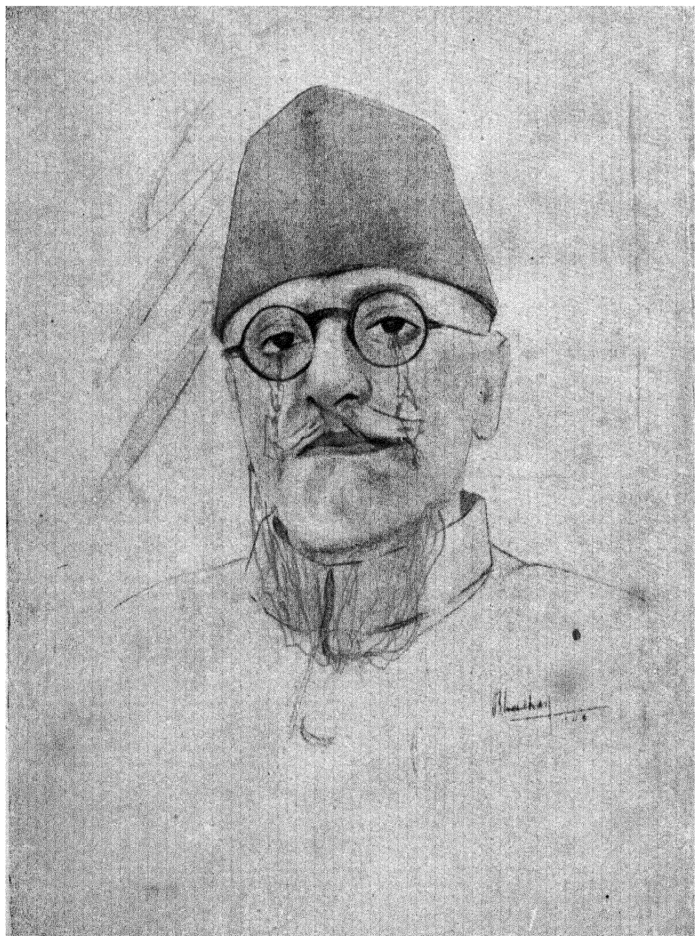
نفسیاتی مطالعہ

از

قاضی محمد عبدالغفار

سنہ ۱۹۴۹ء

کسم نائر نے این۔ آئی۔ پی آفسٹ پریس میں چھاپ کر نیشنل انفارمیشن اینڈ پبلیکیشنز لمیٹڈ نیشنل ہاؤس، اپالو بندر بمبئی سے شائع کیا۔



کچھ اندیشہ، کچھ حقیقت

کتنا مشکل کام ہے کسی بڑی شخصیت کی خصوصیات کا صحیح اندازہ کرنا۔ اور اس سے بھی زیادہ مشکل ہے اس اندیشہ کو دل سے نکال لینا کہ کہیں ہم غلط اندازہ تو نہیں کر رہے ہیں۔ میں نے جب ان اوراق کو لکھنے کے لئے قلم اُٹھایا تو اس تردد کو دل سے نہ نکال سکا۔ اس تردد کا اثر میری تحریر میں موجود ہے۔ ان اوراق کا مسودہ لکھ لینے کے بعد بھی میں نے کتنی دفعہ سوچا

اُسے میں میز کی دراز ہی میں پڑا رہنے دوں! یہ لکھت لکھوائی تو تھی اس شوق نے کہ یہ دیکھوں اس مشکل موضوع پر کچھ لکھا بھی جا سکتا ہے یا نہیں، لیکن اب جو لکھ چکا تو مجھے معلوم نہیں کہ کتنا میں نے درست لکھا اور کتنا نادرست۔ ایسے لوگ جو **مولانا** سے کم و بیش واقف ہونے کا دعویٰ کر سکتے ہیں

خدا جانے کیا کہیں گے جب وہ میری اس جسارت کا مطالعہ کریں گے ــ اور پھر اخباری تبصرہ نگار کا تبصرہ کیا ہوگا ؟ میں ساری عمر اخبار نویسی کرتا رہا اس لئے جانتا ہوں کہ اخبار نویس اگر سب سے زیادہ کسی سے ڈرتا ہے تو اپنے ہی قبیلہ سے ڈرتا ہے ! اپنی ہی کسوٹی پر اپنی جنس کو رکھ دینا آسان کام نہیں !

میری لکھائی کا ڈھنگ ایسا ہے جیسے کسی مرض کا دورہ پڑے ۔ جب لکھنے کا دورہ پڑتا ہے تو لکھے چلے جاتا ہوں، صبح شام دوپہر، اور نہیں لکھتا تو مہینوں ایسے گذرتے ہیں کہ قلم کو کاغذ سے دشمنی ہوجاتی ہے ۔اس دورہ کی کیفیت تو ایسی ہوتی ہے جیسے شرابی کا نشہ، لیکن جب وہ وقت گذر جاتا ہے تو جیسے بادل برس کر کھل جائے !

آخر ۱۹۴۷ء میں جب سرزمین دہلی پر ایک قیامت برپا تھی ، میں حیدرآباد کی سکونت ترک کرکے یہاں آیا ۔ اُس وقت سے آج تک زیادہ وقت حضرت **مولانا** کی مہماں نوازی سے مستفید ہونے میں گذرا ۔ ۱۹ اکبر روڈ گویا میرا گھر بن گیا ۔ اب **مولانا** کی ذات اور بھی زیادہ مرکز نظر ہوگئی اُن کی خاموش خلوت اور سنجیدہ جلوت (خلوت زیادہ اور جلوت کم !) نظر کے سامنے رہنے لگی ۔ ہندستان اور حیدرآباد نے افکار کو بہت منتشر کر دیا تھا ، اب ۱۹ ، اکبر روڈ کی خاموشی میں اُن افکار کو از سر نو سمیٹنے کا موقعہ ملا ۔

خیالات کی پھر کچھ شیرازہ بندی شروع ہوئی۔ "لیلیٰ کے خطوط" کے بعد ادبی کاوشوں کا راستہ بہت کچھ بدل گیا تھا اور پھر "آثار جمال الدین افغانی" کے بعد تو قلم نے اپنا رُخ بالکل ہی بدل دیا۔ افغانی کو دیکھا نہ تھا مگر ڈھونڈا تھا اور تھوڑا بہت پایا بھی تھا۔ لیکن اب کچھ ویسی ہی ایک جنس عزیز اپنے وطن میں بھی نظر سے دُور نہ تھی۔ اُس کے علمی مطالعہ کی تو مجھ میں نہ اہلیت تھی اور نہ ہمت، البتہ نفسیاتی مطالعہ کا میدان میرے لئے کچھ ایسا تنگ بھی نہ تھا، گذشتہ ڈیڑھ سال کی خاموشی میں بہت کچھ دیکھتا رہا، سُنتا رہا اور سوچتا رہا۔ وقتاً فوقتاً طبیعت پر مولانا کی سیرت کے کچھ نفسیاتی نقوش بیٹھتے رہے اور پھر گذشتہ چند ماہ کا وقفہ تو ایسا ملا کہ میں نے کہا کہ

آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہِ طور کی!

قلم ہاتھ میں لیکر بیٹھا تو نفسیاتی مطالعہ کے لئے لیکن اس مطالعہ اور فکر میں کچھ وقت صرف کروں؟ اتنا صبر نہ ہو سکا۔ جب لکھنا شروع کیا تو گویا ایک ہی سانس میں لکھتا چلا گیا۔ راہ میں ایسی منزلیں بھی آئیں، جہاں مجھے ٹھہرنا چاہیئے تھا، مگر نہ ٹھہرا۔ ایسے مقام بھی آئے جہاں کچھ سوچنا چاہیئے تھا مگر نہ سوچا! — لکھتا چلا گیا اور اب جو کچھ لکھا وہ آپ کے سامنے ہے۔ اس میں نقائص بھی ہوں گے، انتشار بھی ہوگا، اجتہادی غلطیاں بھی ہوں گی۔ مگر انِ اوراق کے معاملہ میں لکھنے کا جو تقاضہ مجھے بے اختیار

دوڑائے لئے جاتا تھا وہ تصنیف و تالیف کے تمام مسلمات سے باغی تھا۔

اس طرح حرفوں کی یہ تصویر اور کششوں اور دائروں کا یہ مرقع تیار ہو گیا۔ قلم نہ کسی مفکّر کا تھا نہ کسی فن کار کا، خطوط اور دائرے سب اضطراری ہیں۔

میری نسبت یہ سوءظن بھی نار وا ہوگا کہ میں نے اس مسودہ پر نظرِ ثانی کرنے کی کوئی کوشش کی! اس کام پر بھی میں اپنے لاوبالی مزاج کو آمادہ نہ کر سکا۔

اس بے لگام نگارش نے حضرت مولانا ہی کے گھر میں اپنی سب منزلیں طے کیں، لیکن میں نے خود مولانا کو اپنی اس مصروفیت سے بے خبر رکھا۔ ڈر یہ تھا کہ اگر کہیں فرما دیا کہ یہ سب فضول ہے تو اس کا جواب کیا ہوگا! اس طرح چوری کا یہ عمل جاری رہا تا آنکہ مسودہ میرے ہاتھ سے نکل گیا۔

اب اس فکر میں ہوں کہ جب یہ اوراق مولانا کے سامنے پہنچیں گے تو وہ کیا فرمائیں گے۔ میں تو کہہ دوں گا کہ یہ کتاب نہ میری تالیف ہے اور نہ مجھے اس کی کچھ خبر کہ کس نے لکھی اور کب لکھی! اگر ناشر نے اس کتاب پر میرا نام لکھ دیا تو یہ اُس کا قصور ہے!

حضرت مولانا کی عظمت اور بڑائی کو اگر میں اِن اوراق میں پوری طرح ظاہر نہ کر سکا تو اُس کے متعلق میرا اعتذار ایک مشرقی مفکّر کے اِن الفاظ میں موجود ہے :-

"میں نے ساحل پر کھڑے ہو کر ایک جہاز کو دیکھا جو اپنے سفید بادبانوں کو کھولے ہوئے سمندر کی وسعتوں کی جانب بہا جا رہا تھا۔ وہ جس قدر میری نظر سے دور ہوتا گیا اُس کی جسامت کم ہوتی گئی ، اور جب وہ اُس خطِ اُفق پر پہنچا جہاں سمندر سے آسمان مل جاتا ہے تو تماشائیوں نے کہا :- لو : جہاز تو غائب ہو گیا !
میں نے کہا :- جہاز غائب نہیں ہوا ہے اور نہ اُس کی جسامت کم ہوئی ہے - وہ تو اب بھی اُس خطِ اُفق پر اتنا ہی بڑا ہے جتنا کہ بندرگاہ میں تھا۔ اُس کے قد و قامت کا اختصار درحقیقت ہمارے دماغوں اور ہماری نظروں میں ہے - سمندر کی سطح پر اُس کی بڑائی وہی ہے جو تھی ۔ صرف ہم اُسے چھوٹا دیکھتے ہیں اس لئے کہ دُور سے دیکھتے ہیں ۔ یہ قدریں اور قیمتیں خود ہماری نظر کی ہیں ـــــ اصلیت میں تو اپنی جگہ کوئی تغیر نہیں !"

یہ میرا جواب اُن لوگوں کے لئے ہے جو یہ سمجھیں کہ میں

سپنے موضوع کی حقیقت کو پوری طرح پیش نہ کرسکا۔

ع غ

نئی دہلی
۲۳ مارچ سنہ ۱۹۴۹ء

کچھ اِن اوراق کے متعلق

یہ گذشتہ اپریل ۱۹۴۷ء کی بات ہے کہ لکھنؤ کے ترقی پسند ادیبوں کی ایک مجلس میں حضرت **مولانا ابوالکلام آزاد** کے ادب کی نفسیات پر ایک دلچسپ گفتگو ہو رہی تھی۔ اُس وقت مجھے خیال آیا کہ خود **مولانا** کی نفسیات کو اُن کے ادب میں تلاش کرنا چاہیئے۔ دُور سے دیکھنے والوں کے لئے **مولانا** کی نفسیات ایک بہت ہی مشکل معمّہ ہے جس کو حل کرنے کے لئے **مولانا** کے بہت قریب جانے کی ضرورت ہے۔ لیکن اس ذہنی اتصال کے مواقع شاید ہی چند خوش نصیبوں کو میسر آسکے ہوں!

ادب جس طرح ادیب کے ماحول کا آئینہ ہوتا ہے اسی طرح ادیب کے ادب میں اُس کی شخصی نفسیات کا صحیح عکس بھی دیکھا جا سکتا ہے

بشرطیکہ اُس کے ادب کا تجزیہ کرنے کے صحیح ڈھنگ معلوم ہوجائیں۔ ہندستانی زبان میں اس قسم کے نقد و نظر کا سرمایہ بہت ہی کم ہے۔ بہرحال میں نے ان اوراق میں یہ ایک کوشش شروع کی ہے۔

تذکرہ، الہلال، البلاغ اور غبار خاطر کے صفحات سے زیادہ اس تحقیقات کا مواد کہاں مل سکتا تھا۔ میں نے سب سے پہلے غبار خاطر کو سامنے رکھ کر یہ کام شروع کیا اس لئے کہ وہی مولانا کی تازہ ترین نگارش ہے اور اُسی میں سب سے زیادہ مولانا کے شخصی احساسات کا عکس نمایاں ہوتا ہے۔ جب میں نے یہ "مطالعہ" شروع کیا تو میرے اس تبصرہ کا موضوع نہ تو مولانا کی شخصی زندگی کے معمولات تھے، نہ ان کی خاندانی یا ذاتی عظمت تھی، نہ اُن کی سیاسی زندگی کے کارنامے تھے، نہ اُن کا مجتہدانہ علم و فضل تھا۔ بلکہ میری فکر و نظر کا مرکز صرف اُن کی وہ مخصوص "انفرادیت" تھی جس کے نقش و نگار اُن کی تحریروں میں نمایاں ہوتے ہیں۔ میں نے اس "مطالعہ" میں اپنی مقررہ حدود سے باہر جانا پسند نہیں کیا۔ حتیٰ کہ مولانا کی زندگی کے بعض اہم واقعات اور اُن کے بعض عالمانہ اجتہادات کو بھی یہ سمجھ کر نظر انداز کر دیا کہ وہ اُن کی معنوی اور نفسیاتی زندگی سے کچھ زیادہ تعلق نہیں رکھتے۔

لیکن جب میں اس دلچسپ "مطالعہ" میں مصروف تھا تو بمبئی

کے ناشرین نیشنل انفارمیشن اینڈ پبلکیشنز لمیٹڈ

National Information & Publications Ltd.

نے مجھے دعوت دی کہ میں مولانا کی ایک مختصر سوانحعمری مرتب کروں۔ یہ کام میرے "مطالعہ" کی حدود سے خارج تھا۔ لیکن ناشرین کی خواہش کو پورا کرنے کا میں نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ مولانا کے ادب پر اپنے تبصرہ میں ایک باب کا اضافہ کردیا۔ اس باب میں میں نے مولانا کی زندگی کی وہ سرگذشت مختصراً قلمبند کردی جو عام طور پر کتابوں کی صورت میں مرتب کی جایا کرتی ہے۔ میں خود تو ایسی سوانح نگاری کا قایل ہی نہیں جس کا اساس زندگی کے صرف ایسے واقعات ہوں کہ کب پیدا ہوئے، کس کے بیٹے تھے، کہاں تعلیم پائی، کیا کیا کام کئے، قومی لیڈر تھے تو قوم کی کیا خدمت کی، عالم و فاضل تھے تو علم و فضل کا مقام کیا تھا، وغیرہ وغیرہ۔ یہ ایک مقررہ سانچہ ہے کہ اُس میں کتاب کے ہر باب کو ڈھال کر جماتے چلے جائیے! — کچھ اس طرح کہ اگر نام بدل دیجئے تو شاید ایک بڑے آدمی کی سوانحعمری کسی دوسرے بڑے آدمی کی سوانحعمری بن جائے! گویا کہ ایک ہی ٹھپّہ ہے کہ اُس سے سوانح نگاری کے سِکّے یکساں ڈھلتے چلے جاتے ہیں! میں سوانح نگاری کے فن میں اپنے موضوع کی نفسیات کو بہت

اونچا مقام دیتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ حوادثِ زندگی اور علائقِ حیات کے پس منظر میں ایک بڑے انسان کے ذہنی اور معنوی اور نفسیاتی وجود کا سُراغ پاؤں۔ اِن اوراق میں مری اس خواہش کی تکمیل تو نہیں ہوتی۔ لیکن ہندستانی زبان میں سوانح نگاری کے ایک اسلوب کا آغاز ضرور ہوتا ہے گوکہ وہ کتنا ہی ناقص اور نامکمل سمجھا جائے۔ فی الحقیقت "نقشِ ثانی" ہی اس کتاب کا وہ حصہ ہے جسمیں میں نے سوانح نگاری کا یہ نیا زاویہ پیش کرنے کی ایک ناتمام کوشش کی ہے اور میری رائے میں وہی حاصلِ کتاب ہے۔

اگر ناشرین کی خواہش کو بھی پورا کرنا مدِّ نظر نہ ہوتا تو میں صرف "نقشِ ثانی" ہی "آثارِ ابوالکلام آزاد" کے نام سے شائع کراتا۔ لیکن سوانح نگاری کی رسمِ کہن کو پورا کرنے کے لئے مجھے "نقشِ اول" بھی لکھنا پڑا۔ خود میری رائے میں یہ "نقشِ اوّل" بلحاظِ اہمیت "نقشِ ثانی" سے کمتر ہے۔ مولانا کے علم و فضل، اُن کی فکر و نظر کی وسعت اور اُن کی قومی خدمات سے اس ملک میں صرف وہی شخص ناواقف ہوگا جس کو فیضانِ قدرت سے فہمِ عامہ کا ذرا سا حصہ بھی نصیب نہ ہوا ہو، لیکن مولانا کے ایسے ہموطن تو لاکھوں اور کروروں ہوں گے جنہوں نے اُنھیں دُور سے تو دیکھا مگر کبھی اُس خلوت نشین انسانیت کو

قریب سے نہ دیکھ سکے جو علم وفضل کے تقدس اور قیادت و خطابت کے پردوں کے پیچھے متمکن ہے!

مولانا کی تحریروں کے جو اقتباسات اور حوالے اِن اوراق میں درج کئے گئے ہیں اُن کے انتخاب میں جہاں تک بھی ممکن ہوا اس کا لحاظ رکھا گیا ہے کہ ایک ہی موضوع پر متعدد حوالے پیش نہ کئے جائیں اور اس بات کی بھی کوشش کی گئی ہے کہ یہ حوالے زیادہ طویل نہ ہوں۔ اگر وہ سب اقتباسات اور حوالے درج کر دئے جاتے جن کا میں نے انتخاب کیا تھا تو اس کتاب کی ضخامت بہت زیادہ ہو جاتی۔ "نقش ثانی" میں بھی اختصار کو مدنظر رکھا گیا ہے تاہم مولانا کی معنوی زندگی کے بعض حقائق کو اُن کے ادب سے اخذ کرنے کے لئے بعض طویل اقتباسات کو بھی شامل کرنا پڑا ہے۔ اس کے بغیر میرا مقصود ہاتھ سے جاتا تھا۔

اگر ان اوراق کے پڑھنے والے اُن کو یہ سمجھ کر پڑھیں گے کہ یہ کوئی سوانحعمری ہے جیسی کہ سوانحعمریاں لکھی جایا کرتی ہیں تو میں سمجھتا ہوں کہ میری یہ محنت اکارت جائے گی۔ رہا یہ امر کہ حضرت مولانا کے نفسیات کے "مطالعہ" کی یہ کوشش کس حد تک کامیاب ہوئی تو اس کا فیصلہ اس کتاب کے لکھنے والے سے بہتر اُس کے پڑھنے والے ہی کر سکینگے

نقشِ اوّل

"ملکوں اور قوموں کی تاریخ میں ایک وقت آتا ہے جبکہ انسانوں کے لئے زندگی کی خواہش معصیت ہو جاتی ہے اور زندہ رہنے سے بڑھ کر اور کوئی جرم نہیں ہوتا۔ جبکہ اونچی اونچی دیواروں اور آہنی دروازوں کی آبادی بڑھ جاتی ہے اور آہنگر کی صنعت کی سب سے زیادہ مانگ ہوتی ہے۔ جبکہ درختوں کی ٹہنیوں میں رسیاں لٹکائی جاتی ہیں اور جبکہ لکڑی کے تختے بنائے جاتے ہیں تاکہ اُن پر فرزندانِ آدم کھڑے کئے جائیں۔ یہ وقت آتا ہے اور انقلابِ اُمم کے ایک قدرتی قانون کے تحت گزر جاتا ہے اور پھر بربادی و ہلاکت کا ہر وہ بیج جو زمین میں ڈالا گیا تھا نئے موسم کے شروع ہوتے ہی زندگی اور حیات قائم و دایم کا پھل پیدا کرتا ہے۔"

(مولانا ابوالکلام آزاد۔ سنہ ۱۹۱۳ء)

"قومیت کی روح ہمیشہ افراد کی غفلت میں سوتی ہے، ذہن و دماغ کے تغیرات میں خواب دیکھتی ہے، جذبات کے ہیجان میں کروٹ بدلتی ہے، اور بالآخر جد و جہد کے میدان میں اُٹھ کھڑی ہوتی ہے۔ پھر یہ جد و جہد ایسا سفر ہے جس کی بندھی ہوئی منزلیں ہیں اور ٹھہرائے ہوئے رسم و راہ ہیں، جو ضرور ہے کہ ہر قوم کو پیش آئیں اور ضرور ہے کہ ہر کامیاب قافلہ ان میں سے گذرے۔ جس طرح اسکی کامیابیاں عظیم ہیں اسی طرح اس کی رکاوٹیں بھی بیشمار ہیں اور جس طرح اس کی فتحمندی اٹل ہے اسی طرح اس کی مشکلات بھی ناگزیر ہیں۔"

(مولانا ابوالکلام آزاد۔ سنہ ۱۹۲۳ء)

"یقیناً تم کچھ نہیں کر سکتے اگر تم ایسا سمجھتے ہو کہ کچھ نہیں کر سکو گے۔ بعضوں نے سمجھا کہ کچھ نہیں کر سکیں گے اور بعضوں نے خیال کیا کہ اگر کرنا چاہیں گے تو سب کچھ کر سکیں گے۔ پہلے خیال کا نتیجہ یہی نکلا کہ کچھ نہ ہوا لیکن

دوسرے خیال نے چٹیل میدانوں کو ایوان و محل، ویران جنگلوں کو آباد و شاداب ، دریاؤں کو خشک میدان پہاڑوں کو سطح زمین، غلاموں کو آزاد، ایک گڈریئے کو صاحبِ تاج و تخت اور ایک مردہ قوم کو زندہ و قائم کر دیا۔"

(مولانا ابوالکلام آزاد ۱۹۱۳ء)

---

(۱)

یہ قصہ ۱۹۰۴ء کا ہے۔ یہ بھی نہیں کہہ سکتے کہ

یہ قصہ ہے جب کا کہ آتشؔ جواں تھا!

اس لئے کہ مولانا کی عمر اُس وقت ۱۶ برس سے زیادہ نہ تھی۔ اس زمانہ میں ہندستانی مسلمانوں کی قومی اور تعلیمی تحریکوں کے دو ہی بڑے مرکز تھے۔ ایک علی گڈھ جو "محمڈن اینگلو اورینٹل ایجوکیشنل کانفرنس" کا صدر مقام تھا۔ اور جہاں "اورینٹل" کے ساتھ "اینگلو" کے شرط کا قائم رہنا قومی خدمت کے لئے ضروری اور ناگزیر سمجھا

گیا تھا) اور ایک لاہور جہاں انجمن حمایت اسلام کے پلیٹ فارم پر ہر سال ایک دفعہ اُس زمانہ کے تمام "بزرگان ملّت" جمع ہوا کرتے تھے۔ شمس العلماء مولانا نذیر احمد، مولانا حالی، مولانا شبلی، نواب محسن الملک، شیخ محمد اقبال (جن کی شاعری کا وہ ابتدائی دور تھا)، شیخ عبد القادر اور اسی درجہ کے اکثر علماء و فضلاء، ادیب و خطیب اور مبلّغ و مقرر انجمن کے جلسوں کی زینت ہوتے تھے اور "قوم" ہزارہا کی تعداد میں ملک کے دُور دراز گوشوں سے وہاں آتی تھی تاکہ اِن حضرات کے مواعظ حسنہ سے مستفید ہو۔ علی گڑھ اور لاہور کا وہ پلیٹ فارم گویا اُس زمانہ میں مسلمانوں کی درجہ اوّل کی لیڈری کا اعلیٰ ترین مقام تھا جس تک ہر کس و ناکس کی رسائی مشکل تھی۔

مولانا اُس زمانہ میں اپنا اخبار لسان الصدق نکال رہے تھے! اور اُس اخبار کے مضامین نے ملک کو اُن کے نام سے آشنا کر دیا تھا۔ شخصی طور سے اُس وقت تک بہت کم لوگ مولانا سے واقف تھے، البتہ اُن کی تحریروں سے لوگوں کو یہ گمان ہوتا تھا کہ لسان الصدق کے مدیر بھی علم و فضل کے کوئی سرمایہ دار ہیں۔ چنانچہ اسی بنا پر انجمن حمایت اسلام نے پہلی دفعہ اُنہیں مذہب کے متعلق کسی موضوع پر ایک مقالہ پڑھنے کی دعوت دی۔ اُس دن علم و فضل کے مسند نشینوں کی اس محفل میں ایک عجب تماشا

دیکھا گیا۔ پلیٹ فارم پر بزرگانِ ملت صف در صف متمکن تھے، وقت آیا کہ **لسان الصدق** کے مدیر کو صدرِ جلسہ آواز دیں کہ وہ پلیٹ فارم پر تشریف لاکر اپنا مقالہ سُنائیں۔ حاضرین بھی دیکھنا چاہتے تھے کہ یہ کون بزرگ ہیں جو پہلی دفعہ اس علمی اور قومی مجلس کے منظرِ عام پر تشریف لارہے ہیں۔ اُنکے تصور میں کسی ایسے ہی معمر اور مقدس بزرگ کا سراپا ہوگا جیسے کہ اُس زمانہ میں انجمن کے پلیٹ فارم پر نظر آیا کرتے تھے، لیکن لوگوں نے دیکھا کہ ایک پندرہ سولہ برس کا نوجوان جس کے چہرے پر داڑھی مونچھ کا ایک بال بھی نمایاں نہ تھا، دُبلا پتلا، سُرخ و سفید علماء کے اس مجمع کے سامنے آکر کھڑا ہوگیا۔ حاضرین سمجھے کہ یہ نوجوان تو آزاد ہو نہیں سکتے، غالباً یہ کوئی دوسرے صاحب ہیں جو **لسان الصدق** کے مدیر کا مقالہ پڑھ کر سنائیں گے۔ مگر بعض جاننے والوں نے بتایا کہ نہیں! آزاد تو یہی ہیں! بعض نے یقین کیا اور بعض نے یقین نہ کیا۔ لیکن جب نوجوان مدیر نے اپنے موضوع پر تقریر شروع کی۔ تو حاضرین محوِ حیرت تھے کہ ایسی سحر طراز آواز تو کبھی پہلے اس پلیٹ فارم پر سُنی نہ گئی تھی۔ گویا یہ ایک نیا ستارہ تھا جو انجمن حمایت اسلام کے آسمان پر طلوع ہورہا تھا۔ اور اس طرح لاہور ہی کی ہنگامہ پرور سرزمین پر **ابوالکلام آزاد** کا جھنڈا پہلی دفعہ نصب ہوا۔

اسی قسم کا ایک لطیفہ آصف علی صاحب نے بھی اپنے ایک مضمون میں بیان کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ۱۹۰۴ء میں مولانا کی ملاقات مولانا حالی سے ہوئی جنہیں کسی طرح اس بات کا یقین نہ آتا تھا کہ ۱۶ سال کی عمر کا یہ نوجوان لسان الصدق کا مدیر ہوسکتا ہے! بعد میں مولانا اور مولانا حالی کے درمیان بہت ہی مخلصانہ تعلقات قائم ہوگئے۔ مولانا شبلی سے بھی مولانا نے ۱۴ سال کی عمر میں خط وکتابت شروع کی تھی، اُسی زمانہ میں انہوں نے شیخ عبدالقادر کے مشہور رسالہ مخزن میں چند مضامین لکھے تھے۔ ۱۹۰۴ء میں جب مولانا شبلی سے بمبئی میں ملاقات ہوئی تو اُنہوں نے مولانا کے مضامین کی بہت تعریف کی لیکن یہ سمجھ کر کہ وہ مولانا سے نہیں بلکہ مولانا کے فرزند سے گفتگو کر رہے تھے!۔ یہ بیان بھی آصف علی صاحب ہی کا ہے کہ نواب محسن الملک مولانا کے متعلق فرمایا کرتے تھے کہ وہ "عمر میں چھوٹے مگر علم میں بڑے" ہیں۔

لاہور کے جلسہ کے بعد جب مولانا دنیا کے سامنے آئے تو وہ اپنے ساتھ اپنے خاندانی علم وفضل اور تقدس کی روایات ہی نہیں لائے بلکہ ایک طاقتور "جی نی اس" Genius کی بے پناہ قوت اجتہاد بھی لیکر آئے جس نے اُنہیں آبا و اجداد کے حلقہ افکار کے باہر بہت سی نئی راہیں دکھائیں اور دنیا کو ایک ایسی زبردست

"انفرادیت" سے آشنا کیا جیسی کہ صدیوں سے اس ملک میں پیدا نہ ہوئی تھی۔

(۲)

۱۸۸۸ء کے ماہ ستمبر کا وہ ایک دن تھا جب شہر مکّہ کے باب السلام کے جوار میں مولانا شیخ محمد خیر الدین دہلوی کا بلند اقبال بیٹا احمد پیدا ہوا۔ مولانا خیر الدین علماء اور فضلاء کے ایک ایسے خاندان علم وفضل کے امانت دار تھے جس کی گذشتہ نسلوں میں چند بہت بڑے علمبرداران حق وحریت پیدا ہو چکے تھے اُن علمائے حق کے تذکار آج بھی تاریخ کے صفحات پر محفوظ ہیں۔ اسی خاندان کے ایک عظیم المرتبت رکن شیخ جمال الدین تھے جنہوں نے اکبر اعظم کے عہد میں شہنشاہ کی امامت کے محضر پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا تھا اور انکار بھی اس حالت میں جبکہ دربار شاہی کے بڑے بڑے علماء بادشاہ کی امامت کو جزو ایمان قرار دے رہے تھے۔ مولانا نے اپنے سلسلہ خاندان کے احرار اور مجاہدین حق کی یہ داستان تذکرہ کے صفحات پر تفصیل کے ساتھ بیان فرمائی ہے اور محضر امامت اور شیخ جمال الدین کا قصہ بیان کرتے ہوئے "علماء سوء" کی نسبت اپنے احساسات

کو بھی صاف صاف ظاہر کر دیا ہے۔ **تذکرہ** ۱۹۱۲ء میں شائع ہوا تھا اس لئے یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ آج سے ۳۶ سال پہلے بھی **مولانا** مذہب اور اہلِ مذہب کے متعلق اپنا ایک خاص نقطۂ نظر رکھتے تھے۔ دورِ اکبری کے "علماءِ سوء" کا ذکر کرتے ہوئے **مولانا** نے **تذکرہ** میں لکھا تھا کہ

یہی صورتِ حال آج بھی درپیش ہے۔ مذہب کے دوکانداروں نے جہل و تقلید اور ہوا پرستی کا نام مذہب رکھا ہے اور روشن خیالی اور تحقیقِ جدید کے عقل فروشوں نے الحاد و بے قیدی کو حکمت و اجتہاد کے لباسِ فریب سے سنوارا ہے۔ نہ مدرسہ میں علم ہے نہ محرابِ مسجد میں اخلاص اور نہ میکدہ میں رندانِ بے ریا۔ اربابِ صدق و صفا ان سب سے الگ ہیں اور سب سے پناہ مانگتے ہیں۔ اُن کی راہ دوسری ہے۔

ہم کعبہ و ہم بت کدہ سنگِ رہِ ما بود
رفتیم و صنم بر سرِ محراب شکستیم

یہی راہ آج بھی **مولانا** کی ہے کہ وہ نہ تو مذہب کے دوکانداروں کے وجود کو گوارا کرتے ہیں اور نہ روشن خیالی اور تحقیقِ جدید کے مدعیوں کے دعوے کو تسلیم کرتے ہیں۔ اُن کی راہ اِن دونوں سے الگ ہے۔ اکبر کے محضرِ امامت

کے متعلق شیخ جمال الدین کے انکار کا واقعہ اس طرح بیان فرماتے ہیں کہ

"عہد اکبری میں بھی ارباب حق و صفا کا جو گروہ تھا وہ ان دونوں سے الگ تھا اور چونکہ دربار شاہی پر بدبختانہ یکے بعد دیگرے اِن ہی دو گروہوں کا تسلط رہا اس لئے اُن کو طرح طرح کے مصائب و آلام سے دوچار ہونا پڑا۔ حضرت شیخ جمال الدین بھی اُن ہی لوگوں میں سے تھے۔ خاندان ملا مبارک (یعنی ابوالفضل فیضی) نے مولویوں کا زور توڑنے کے لئے ایک تدبیر یہ کی کہ ۹۸۷ھ میں اپنے والد ملا مبارک سے ایک محضر تیار کرایا مضمون یہ تھا کہ "بادشاہ خلیفۃ الزماں اور امام عہد واجب الاطاعت ہے اور اس کو حق پہنچتا ہے کہ مسائل مختلف فیہا میں حسبِ ضرورت وقت اجتہاد کرے اور اس کا اجتہاد واجب العمل ہے۔" اصلاً تو یہ بات ٹھیک تھی، فی الحقیقت خلیفہ وقت و ارباب حل و عقد و اصحاب شوریٰ کو ہر عہد و دور میں حق اجتہاد حاصل ہے اور اُسی کے سدباب نے تاریخ اسلام کے تمام مصائب کی بنیاد ڈالی۔ مگر مصیبت یہ تھی کہ اکبر بالکل مذہب سے بے خبر تھا اور اس کے مشیروں کا رنگ دوسرا تھا۔ نتیجہ یہ نکلتا (اور نکلا)

کہ بادشاہ کی امامت واجتہاد بے قیدی والحاد کا ایک محکم ذریعہ بن جاتی اور بالاخر بنی۔ اس لئے ضرور تھا کہ علماء حق کو اس محضر کے قبول کرنے میں سخت تامل ہو۔

چنانچہ حضرت شیخ جمال الدین نے اس محضر پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا اور اس انکار کی پاداش میں اُنہیں دربار شاہی کی ناخوشی کا شکار ہونا پڑا۔ یہاں اس تمام قصہ کا دہرانا ضروری نہیں بتانا صرف یہ ہے کہ اِن خاندانی روایات سے بلاشبہ مولانا کی کردار بہت متاثر ہوئی۔ مگر مولانا کی "جی نی اس" اپنے خاندان اور اُس کے قدیم تاریخی ماحول کی بھی پابند نہ ہو سکی اور کوئی "جی نی اس" بھی اپنے ماحول کی پابند نہیں ہوا کرتی اور اگر ہو تو وہ "جی نی اس" نہیں۔ خود مولانا نے بار بار اپنی تحریروں میں اپنی زندگی کی اس حقیقت کو تسلیم کیا ہے کہ اُن کی قوت اجتہاد بڑی حد تک خاندانی رسم وراہ کی پابندیوں سے آزاد رہی ہے۔ لیکن طلب حق اور استقرار و اعلان حق کے باب میں اُنہوں نے یقیناً اپنے آبا و اجداد کی سنت اختیار کی اور اسی لئے انہوں نے تذکرہ میں سب سے زیادہ زور علمائے حق اور علمائے سو کی کشمکش پر دیا ہے اور اس طرح گویا اس امر کی وضاحت کر دی ہے کہ خود اُن کا مسلک کیا ہے۔

مولانا کی ابتدائی تعلیم کا تذکرہ بھی کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا۔

"جی نی اس" کی حقیقی اور فطری "استعداد" کسی اُستاد اور رہنمائے طریقت کی بہت کم مرہونِ منت ہوا کرتی ہے۔ **مولانا** نے علم وفضل کی جو راہ اختیار کی اُس میں وہ نہ تو کسی کے شاگرد تھے اور نہ کوئی اُن کا استاد تھا۔ اس واقعہ کا اظہار اُنہوں نے بار بار اپنی تحریروں میں کیا ہے۔ اُن کی ذہنی نشوونما میں اگر اُن کی طالبعلمانہ زندگی بھی کسی حد تک معاون ہوئی تو وہ غالباً **جامعہ ازہر** کی علمی صحبتوں کا نتیجہ ہوگا۔ جہاں اُس زمانہ میں **سیّد جمال الدین افغانی** اور **مفتی عبدہ** کے نقوش قدم سے علماء اور طلبا وسیع النظری اور اجتہاد صالح کی ایک نئی روشنی حاصل کر رہے تھے اور ملک کی ذہنی زندگی نے ایک پلٹا کھایا تھا۔ کچھ عجب نہیں کہ **مولانا** نے بھی اُسی زمانہ میں **ازہر** کے ترقی پسند علماء کے حلقۂ درس میں وسیع تر فکر و نظر کے اشاروں سے اپنی "جی نی اس" کو ہم آہنگ کیا ہو۔ گو کہ وہ اپنی تحریروں میں اس کا کوئی ذکر نہیں کرتے لیکن یہ گمان قابل فہم ہے۔ درس نظامی کی تکمیل **مولانا** نے زیادہ تر کلکتہ میں اور اپنے والد ماجد کے حلقہ درس میں کی تھی لیکن اس زمانہ میں بھی اُن کی "انفرادیت" حلقہ درس کی حدود کو توڑ کر آگے نکل گئی تھی اور طالبعلمانہ زندگی کے مشاغل میں بھی وہ اپنی ارتقا کے درجے طے کر رہی تھی۔ **مولانا** کے ایک سوانح نگار نے اُس زمانہ کا یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ **مولانا** جب ایک کند ذہن پٹھان کو منطق کا سبق دے رہے تھے تو

اُس کی نافہمی سے آزردہ ہوکر اُنہوں نے اُس کو بُری طرح جھڑکا اور طنزاً اُس سے کہا کہ وہ بجائے منطق پڑھنے کے اپنے وطن کو واپس جائے اور وہاں کی بھیڑ بکریوں کی طرح گھانس چرا کرے! اس "نوعمر استاد" کا یہ شاگرد ایک بوڑھا آدمی تھا۔ اُسے اس قدر رنج ہوا کہ اُس نے دن بھر کھانا نہ کھایا۔ جب **مولانا** کے والد ماجد کو اس واقعہ کی خبر ہوئی تو انہوں نے **مولانا** کو تنبیہہ کی اور حکم دیا کہ وہ اُس بوڑھے آدمی سے معافی مانگیں۔ فطری ذہانت اور مزاج کی بالانشینی اور پست استعداد کو گوارا نہ کر سکنے کی طبعی خصوصیت کا یہ ایک ابتدائی مظاہرہ تھا جو آگے چل کر **مولانا** کی شخصیت کا ایک نمایاں عنصر بن گیا۔

(۳)

تحصیل علوم کی تکمیل کے لئے **مولانا** **ازہر** بھیجے گئے۔ وہاں سے واپس آتے ہی اُن کی جوانی پہلی مرتبہ اور شاید آخری مرتبہ عشقِ مجازی کے ایک طوفان میں مبتلا ہوئی۔ اس واقعہ کا ذکر **مولانا** نے **تذکرہ** کے آخری باب اور **غبارِ خاطر** کے اوراق پر بہت ہی دُھندلے اور دھیمے اشاروں میں کیا ہے۔ شاعرانہ اندازِ بیاں اس "واردات" کی

تمام تفصیلات کا پردہ دار ہے۔ اپنی جوانی کے اس ہنگامہ کا حال اسطرح بیان فرماتے ہیں کہ:۔

"غفلت و مدہوشی نے افسوں پھونکا، سرمستی و سرگرانی نے جام بھرے، جنون شباب نے ہاتھ پکڑا اور ولولوں اور ہوس کے تقاضوں نے جو راہ دکھائی دل کی خود فروشیوں نے اُسی کو منزلِ مقصود سمجھا ہوش و خرد کو گو پہلے حیرانی ہوئی۔ لیکن پھر اُس نے بھی آگے بڑھ کر اشارہ کیا۔ راہ ہے تو یہی راہ ہے۔ اور وقت ہے تو اسی کا

ساقیا مرنج از من عالم جوانی ہا است

جس طرف نظر اٹھائی ایک صنم آباد الفت و پرستش نظر آیا جس میں مندروں اور مورتیوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ ہر مندر جبینِ نیاز کا طالب، ہر مورتی دلفروشی و جان سپاری کے لئے وبال ہوش، ہر جلوہ برق تمکین و اختیار، ہر نگاہ بلائے صبر و قرار،

الفراق اے صبر و تمکیں الوداع اے عقل و دیں

جس راہ میں قدم اُٹھایا زنجیروں اور کمندوں نے استقبال کیا، جس گوشے میں پناہ لی وہی زندان ہوش و آگہی نکلا بجلیاں کوندتی رہیں با دل گرجتے رہے، لیکن افسوس کہ نیند بھی بڑی ہی سخت تھی اور پشتِ غفلت کسی بڑے ہی سخت تازیانے کا

انتظار کر رہی تھی .... بہتر یہ ہے کہ.

صاف ہی صاف کہہ دیا جائے

ہاں! بانگِ بلند است ایں پوشیدہ نمی گویم

گمراہی عمل کی آخری حد فسق ہے اور گمراہی اعتقاد کی الحاد فسق و الحاد کی کوئی قسم ایسی نہ تھی جس سے اپنا نامہ اعمال خالی رہا ہو........

غرض کہ اپنی غفلت پرستیوں کا تو یہ حال تھا لیکن اُدھر کارفرمائے غیب کا فیصلہ کچھ دوسرا ہی ہو چکا تھا...... ناگہاں جذب توفیق الٰہی پردہ عشق مجاز میں نمودار ہوا اور ہوس پرستی کی آوارگیوں نے خود بخود شاہراہِ عشق و محبت تک پہنچا دیا ...."

اِن ارشادات کے پردے میں **مولانا** صرف ایک ہی حقیقت کو صاف صاف بیان فرماتے ہیں جب وہ تسلیم کرتے ہیں کہ زندگی کے اسی جذباتی اور طوفانی دور نے — جو غالباً بہت مختصر تھا — اُن کو زندگی کی لازوال حقیقتوں کی راہ پر لگایا، اُن کے لئے حقائق کے دروازے کھولے اور اس طرح اُس پردہ مجاز میں اُن کے افکار نے حقیقت کے نور سے جلا پائی۔ اے کاش کہ **مولانا** اسی شورش مجاز کی کچھ زیادہ تفصیلات بیان کرنے پر اپنے کو آمادہ کر سکتے یا کوئی [illegible] ہوتا کہ ہم

اُن مجازی محرکات کی جستجو کر سکتے۔ یہ میں اسلئے کہتا ہوں کہ سوانح نگاری کا حق ادا کرنے کے لئے مشاہیر کی زندگی کے اس رُخ کا بھی دیکھنا ضروری ہے۔ یورپ کے چند ترقی پسند سوانح نگاروں نے اپنی تصانیف میں اس راہ کی قدیم رکاوٹوں کو دور کرنے کی کوشش شروع کی ہے، لیکن مشرقی زبانوں اور خصوصاً ہندستان کی زبانوں میں تو اگر کسی بڑے آدمی کی نفسیاتی اور جنسی زندگی کے اس پردے کا ایک گوشہ بھی اٹھا دیا جائے تو یقین ہے کہ ہر محراب کے نیچے اور ہر منبر کے اوپر ایک شدید زلزلہ آجائے اور قدامت کے قلعوں میں بے پناہ شعلے بھڑکنے لگیں!۔ ایک مجہول سماجی اور اخلاقی احساس غضبناک ہوکر چیخنے لگے! کہیں یہ گناہ بھی بخشا جا سکتا ہے کہ کوئی سوانح نگار یہ بتا دے کہ مشاہیر میں سے فلاں بڑے آدمی نے فلاں عورت سے محبت کی تھی یا اتنا بھی کہدے کہ فلاں شخص کسی اور سے نہیں بلکہ صرف اپنی بیوی سے عشق کرتا تھا! تقدس کی خشکی کسی زندگی کی داستان میں یہ نمی برداشت نہیں کر سکتی! لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ کسی بھی بڑے آدمی کی نفسیات کا صحیح مطالعہ کرنے کے لئے اُس کی زندگی کے اس رُخ سے آشنا ہونا ضروری ہے۔ اسی قسم کے جذباتی ہیجان میں اخلاق و کردار کی خصوصیات بے اختیار اور بے محابا ظاہر ہو جایا کرتی ہیں اور ٹھیک اسی حالت میں ہم کسی شخصیت کا " اندر سے " مطالعہ کر سکتے ہیں ہماری ٹھکی ہوئی سماج نے عورت کے وجود کو مرد کی زندگی کا ایک ایسا راز بنا دیا ہے کہ نفسیاتی اور جذباتی نقطہ نظر سے ہم جب کسی مرد کی زندگی

اور کردار کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں تصویر کا صرف ایک ہی رُخ نظر آتا ہے۔ سوانح حیات اور زندگی کے حقیقی وجدان و جذبات کی یہ آدھی تصویریں سوانح نگاری کے صحیح ذوق کو تشنہ چھوڑ دیتی ہیں۔ یہ راقم الحروف کی رائے ہے باوجود اس احساس کے کہ اس رائے کی تائید کرنے والے شاید ہی چند میسر آسکیں۔ سوانح نگاری کا عام اسلوب تو کچھ ایسا ہے کہ وہ اس قسم کی کسی "بدعت" کو برداشت ہی نہیں کرسکتا تاہم **مولانا** نے خود اس قدیم پردہ کا ایک گوشہ اپنی سوانح حیات سے ہٹا دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سماجی زندگی میں عورت کے صحیح مقام کے متعلق **مولانا** کے احساسات کا رُخ اس طرف نہیں ہے جس طرف ہماری سماج کے قدامت پرست علماء دیکھتے ہیں۔ مولانا نے **الہلال** کے صفحات پر بعض سوالات کا جواب دیتے ہوئے اسلام میں عورت کا جو مقام ہے اُس کی تصریح فرمائی ہے۔ اُنہوں نے فطرت الٰہی اور احکام قرآنی کے حوالے دے کر اس مسئلہ کی یوں وضاحت فرمائی ہے کہ :-

عورت مثل مرد کے ایک انسان ہے جہاں باپ کے گھر میں مثل مرد کے پرورش پاتی ہے۔ ... پھر وہ ایک مستقل وجود ہے اور مثل مرد کے انسانیت کا نصف ثانی ہے۔ وہ مرد کے ساتھ رفاقت بدنی اور اقرار کرتی ہے اور اس کے دل کے معاوضہ میں اپنا دل دیتی ہے۔ پس اُسکے گھر میں آکر اُس کے وجود کی شریک تو ضرور ہو جاتی ہے پر اپنے وجود سے محروم نہیں ہو جاتی"

——— پھر مولانا نے " احادیث صحیحہ اور اعمال نبوت وصحابہ کرام کے علاوہ نصوص صریح " سے استدلال کر کے اپنی بحث کو قرآن کریم کی اس آیت پر ختم کیا ہے کہ "

"اور جس طرح مردوں کا حق عورتوں پر ہے۔ اسی طرح عورتوں کے حقوق مردوں پر ہیں"

آزادئ نسواں کے صحیح تصوّر کے لئے مولانا کا یہ نقطۂ نظر یقیناً ہمت افزا ہے۔

چند سال ہوئے جب میں ایک بہت بڑے آدمی کی جو مولانا کے بھی بہت عزیز دوست تھے سوانحعمری مرتب کر رہا تھا تو اُس ذاتی واقفیت کی بنا پر جو مجھے مرحوم کی زندگی کے اُس رُخ سے حاصل تھی، میں یہ چاہتا تھا کہ میری کتاب کا ایک باب اُس داستان عشق کے لئے بھی محفوظ کیا جائے جس میں مرحوم کے کیریکٹر کی خوبیاں چمک رہی تھیں، مگر احباب اور بزرگان ملت گھبرا گئے! ہائیں! یہ غضب! یہ قیامت! دنیا کیا کہے گی! کہیں ایسا بھی ہوا ہے! بہت سمجھایا اور عرض کیا کہ اُس داستان حُسن وعشق میں تو میرے ممدوح کے اخلاق وکردار کے بہت ہی دلفروز نقوش اُبھرتے ہیں، مگر کوئی نہ مانا! عرض کیا کہ جس طرح شراب کی یہ خاصیت مسلّمہ ہے کہ اُسکے نشہ کی حالت میں فطرت انسانی کا عیب وصواب بے اختیار بے پردہ ہو جاتا ہے بالکل اسی طرح ابتلائے مجازی کی بے اختیار کیفیتوں میں

بھی ہم اعلیٰ نفسیات کا صحیح عکس سمجھ لیتے ہیں، لیکن اس کو کیا کیجیئے کہ سماج کے مندر میں رسم و رواج کا جو خونخوار دیوتا بیٹھا ہوا ہے وہ اپنے قانون اور ضابطہ کی خلاف ورزی کسی طرح گوارا نہیں کرتا!

ایک دن جب بعض دوستوں کی صحبت میں اس مسودے کے چند اوراق پر بحث ہو رہی تھی اور کہا جا رہا تھا کہ **مولانا** ایک ایسے "مشکل" انسان ہیں جن کا سمجھنا آسان نہیں تو اُن میں سے ایک صاحب نے اپنا یہ نظریہ پیش کیا کہ ہر "مشکل" انسان کو سمجھنے کے لئے اس کی جذباتی زندگی کو تحقیق کی روشنی میں لانے کی ضرورت ہے۔ میں اس خیال سے بڑی حد تک متفق ہوں لیکن بہرحال وہ کام تو اِن اوراق میں ممکن نہ تھا تاہم چونکہ **مولانا** خود ہی تسلیم کرتے ہیں کہ اُنہوں نے اپنی زندگی کی اس واردات سے عرفانِ حقیقی کی دولت حاصل کی اور اس طرح اُن کی زندگی کا رُخ بدل گیا تو یہ اعتراف بلاشبہ میرے نظریہ کی تائید کرتا ہے اور مجھے یقین ہو جاتا ہے کہ **مولانا** کی زندگی میں وہ عشقِ مجازی ایک بہت بڑی نفسیاتی اہمیت رکھتا ہوگا جس کے بغیر اُن کی سوانح حیات کے یہ اوراق نامکمل ہیں۔

۴

۱۹۰۹ء میں **مولانا** کے والد ماجد کا انتقال ہو گیا اس وقت

وہ تھا جب **مولانا** اپنی زندگی کے دوراہے پر کھڑے ہوئے تھے۔ وہ چاہتے تو اپنے خاندان کی مسند درس و ہدایت پر بیٹھ جاتے اور ایک مذہبی رہنما کی زندگی کا راستہ اختیار کرلیتے۔ لیکن **مولانا کی** "جی نی اس" خود اپنے خاندان کی تقلید پر بھی آمادہ نہ تھی۔ لہٰذا انہوں نے اپنے لئے زندگی کی ایک ایسی راہ اور ایک ایسی منزل قرار دی جہاں خاندانی علم و فضل کا دامن بھی ہاتھ سے نہ چھوٹا اور ملک و ملت کی نشاۃ ثانیہ کی تعمیر میں بھی وہ اپنی خداداد قابلیت صرف کرسکے۔ **مولانا** نے اس باب میں اپنی زندگی کے اصولوں کی جو وضاحت اپنی تحریروں میں کی ہے اُس کا تفصیلی تذکرہ "نقشِ ثانی" میں آئے گا۔ اس وقت تو صرف اتنی ہی بات بتا دینی ہے کہ مذہب اور مذہبی عقائد کے متعلق **مولانا** کا زاویہ نظر خاندانی روایات سے ایک حد تک مختلف اور وسیع تر تھا۔ اُس کو سمجھنے کے لئے **ترجمان القرآن** کے ابتدائی صفحات اور **البلاغ** و **الہلال** کے اوراق کا مطالعہ ضروری ہے۔ **ترجمان القرآن** کے دیباچہ میں اصول ترجمہ و تفسیر سے بحث کرتے ہوئے **مولانا** نے مختصر مگر جامع الفاظ میں اپنے مقام کو واضح کر دیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ:-

"علم و نظر کی راہوں میں آج کل قدیم و جدید کی تقسیمیں کی جاتی ہیں لیکن میرے لئے یہ تقسیمیں بھی کوئی تقسیم نہیں۔ جو کچھ قدیم ہے وہ مجھے ورثہ میں ملا اور جو کچھ جدید ہے اُس کے لئے میں نے اپنی راہیں خود نکال لیں۔ میرے لئے وقت کی جدید راہیں بھی ویسی ہی دیکھی

بھالی ہیں جس طرح قدیم راہوں میں گام فرسائی کرتا ہوں۔ خاندان تعلیم اور سوسائٹی کے اثرات نے جو کچھ میرے حوالہ کیا تھا میں نے اول روز ہی سے اُس پر قناعت کرنے سے انکار کردیا اور تقلید کی بندشیں کسی گوشہ میں بھی روک نہ ہوسکیں اور تحقیق کی تشنگی نے کسی میدان میں بھی ساتھ نہ چھوڑا ....

میرے لئے دل کا کوئی یقین ایسا نہیں جس میں شک کے سارے کانٹے نہ چبھ چکے ہوں اور میری روح کا کوئی اعتقاد ایسا نہیں ہے جو انکار کی ساری آزمائشوں میں سے نہ گزر چکا ہو۔ میں نے زہر کے گھونٹ بھی ہر جام سے پئے ہیں اور تریاق کے نسخے بھی ہر دارالشفا میں آزمائے ہیں۔ میں جب پیاسا تھا تو میری تشنگیاں دوسروں کی طرح نہ تھیں اور جب سیراب ہوا تو میری سیرابی کا چشمہ بھی شاہراہ عام پر نہ تھا .... اس عرصہ کی طلب اور جستجو کے بعد قرآن کو جیسا کچھ اور جتنا کچھ سمجھ چکا ہوں میں نے اس کتاب کے صفحوں پر پھیلا دیا ہے۔"

تقلید کی راہوں سے ہٹ کر اجتہاد کے مسلک کو اختیار کرنا کوئی آسان کام نہیں، خصوصاً ہندستان کی قدامت پرست دنیا میں جہاں ایمان صالح صرف تقلید ہی سمجھی جاتی ہے اور راسخ عقیدہ صرف وہی ہے جو کسی فقیہ یا محدث کی "کتاب میں لکھا ہے!" اس دنیا میں اجتہاد کا مسلک علم و فضل کے علاوہ بھی بہت بڑی اخلاقی جرأت چاہتا ہے۔ **مولانا کی**

زندگی کے ابتدائی دور میں جب وہ قدیم مسلک سے ہٹ کر اپنی راہ خود پیدا کر رہے تھے قدیم "ملّائیت" کا اتنا اثر باقی تھا کہ اُس نے نہ جانے کتنے نزاعی مسائل **مولانا** کے اجتہادات میں پیدا کر دیئے ہوتے اگر ایکطرف خود **مولانا** کا خاندانی وقار اور دوسری طرف سیاسی دنیا میں **مولانا** کے اقدامات نے "ملّائیت" کا راستہ نہ روک دیا ہوتا۔ علاوہ بریں زمانہ بہت تیزی کے ساتھ بدل رہا تھا اور قدیم علما اپنے حجروں اور مدرسوں کے باہر آنے پر مجبور ہو چکے تھے۔ محراب و منبر کے مناظرے نئی "تعلیم یافتہ" نسلوں کے لئے بے مزہ ہو چکے تھے اور مذہبی عقائد کی بحثیں تمسخر انگیز سمجھی جانے لگی تھیں۔ گلوں کی رگوں کا پھولنا باقی تو تھا مگر بہت کم ہو چکا تھا! اس عالت میں **مولانا** اپنی راہ کے بہت سے کانٹوں سے دامن بچا کر گذر سکے۔ تاہم اِن پُرانے تالابوں کے پانی میں کچھ نہ کچھ حرکت تو پیدا ہوتی ہی رہے جبکو **مولانا** کی "انفرادیت" نے کبھی قابل توجہ نہ سمجھا۔ اُنہوں نے اپنی راہ معین کی اور اُس پر چلنے لگے۔



مولانا کی ذہنی جوانی کا سب سے زیادہ موثر مظاہرہ **الہلال** تھا جو ۱۹۱۲ء میں جاری ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ اس سے پہلے چند سال ایسے بھی گذر چکے تھے جب **مولانا** کے جذبات کا ربط بنگال کے وحشت انگیزوں سے

قائم ہونے لگا تھا لیکن بہت جلد باہر کی دنیا کے انقلابات نے انہیں اپنی طرف متوجہ کرلیا۔ **الہلال** کی اشاعت کے وقت تک ہندستانی مسلمانوں کی سیاسی زندگی کا پس منظر کم وبیش وہی تھا جس کا نقشہ **سرسید احمد خاں** نے ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے بعد بنایا تھا۔ اور یہی وہ زمانہ تھا جب "تقسیم کرو اور حکومت کرو"۔ کا سرکاری مسلک اپنے ارتقاء کی منزلیں طے کر رہا تھا اور اس مسلک کی بنیاد پر ایک ایسی عمارت کی دیواریں اُٹھائی جارہی تھیں جس پر بالآخر ۱۹۴۷ء میں ایک سب سے بڑا گنبد "پاکستان" کا تعمیر ہوا! بیسویں صدی کے ابتدائی زمانہ میں انگریزوں کی اس حکمت عملی کے دو بڑے کارندے **علی گڈھ** میں مصروف کار تھے، یعنی ایک **تھیوڈور بک** جنہوں نے خود **سرسید** کو عضو معطل بنا دیا تھا اور ایک **آرچبولڈ**۔ ان دونوں کے ذریعہ سے مسلم قیادت کو متاثر کرکے مسلمانوں کو "جداگانہ حقوق" کی جو افیون کھلائی جارہی تھی اُس کا نشہ انہیں خود فراموشی کی ایک ایسی حالت میں مبتلا کئے ہوئے تھا کہ وہ **کانگریس** کے مقابلہ میں اپنی فریادیں انگریز کی بارگاہ میں لیجانے ہی کو اپنا صحیح تدبر قرار دیتے تھے۔ اکثریت کا خوف اُن کے دل میں جاگزیں کیا جاچکا تھا۔ علی گڈھ کے لیڈر اور **سرسید** کے جانشین اس حکمت عملی کے مخصوص کارندے تھے۔ **آغا خان** کی قیادت میں ان مسلم رہنماؤں کا جو وفد **لارڈ منٹو** کے حضور میں حاضر ہوا یعنی حاضر کرایا گیا وہ ہندستان میں برطانوی تدبر کے جانکاروں کا ایک بہت بڑا کارنامہ تھا۔ اُس وقت علی گڈھ میں **بک** کے جانشین **آرچبولڈ** تھے۔ وہ علی گڈھ کی

تحریک اور حکومت کی حکمتِ عملی کے درمیان ایک مضبوط کڑی بن گئے تھے۔

دوسری طرف **کانگریس** طلب حقوق کے میدان میں ایک ایک قدم آگے بڑھ رہی تھی۔ اُس وقت تک کامل آزادی کا نام اُس کی زبان پر نہ آیا تھا لیکن غیر ملکی اقتدار کی گرفت کو توڑنا اُس کا بنیادی مقصد قرار پاچکا تھا۔ باوجودیکہ متعدد مسلم اہل الرائے کانگریس میں شریک تھے لیکن علی گڑھ کی تحریک انگریزی حکومت کے قدم بقدم چل رہی تھی۔

مسلمانوں کی سیاست کا یہ پس منظر تھا جب نوجوان **آزاد** **مصر** سے فارغ التحصیل ہوکر واپس آئے اور اپنے ساتھ **افغانی** اور **عبدہٗ** کے مکتب خیال کے زندہ تصورات لیکر آئے۔ اُنھوں نے سرزمینِ فراعنہ پر قومی آزادی کے دلفریب چہرے کی ایک جھلک دیکھ لی تھی اور وہ یہ بھی دیکھ آئے تھے کہ بعض اسلامی اور شرقی ممالک میں کس طرح اندھیری رات کے بعد آزادی اور حریت کا آفتاب طلوع ہورہا تھا۔ تعجب نہیں اگر **مصر** کے جدید لٹریچر اور مصری صحافت کے نمایاں رجحانات نے نوجوان **آزاد** کے گرم خون کی گردش کو بھی پہلے سے زیادہ تیز کردیا ہو۔ کم وبیش یہی زمانہ مسلم لیگ کی پیدائش کا زمانہ تھا

بقول پنڈت جواہر لال نہرو Discovery of India

"**مولانا ابوالکلام آزاد** نے اپنے ہفتہ وار **الہلال** میں مسلمانوں کو ایک نئی زبان میں مخاطب کیا" یہ ایک ایسا اندازِ تخاطب تھا

جس سے ہندستانی مسلمان آشنا نہ تھے، وہ علی گڑھ کی قیادت کے محتاط لہجہ سے واقف تھے اور **سرسید، محسن الملک** اور **نذیر احمد** اور **حالی** کے انداز بیاں کے علاوہ ہوا کا کوئی زیادہ گرم جھونکا اُن تک پہنچا ہی نہ تھا۔ **الہلال** مسلمانوں کے کسی مکتب خیال سے متفق نہ تھا۔ وہ ایک نئی دعوت اپنی قوم اور اپنے ہموطنوں کو دے رہا تھا، وہ پہلے ہی دن سے ہندستان کی ایک متحدہ قومیت کا علمبردار تھا۔ اُس کی دعوت سے ہندستان کا اسلامی ذہن اُس وقت تک بالکل بیگانہ تھا" بقول پنڈت **جواہرلال نہرو** Discovery of India **مولانا** نے " قدامت پرستی کے مخالف قومیت کے قلعہ پر حملہ کیا۔ لیکن بخط مستقیم نہیں بلکہ ایسے افکار کی اشاعت کر کے جنہوں نے علیگڈھ کے روایات کی بنیاد کو ہلا دیا۔" علی گڑھ کی روایات کو **مولانا** نے پہلے ہی دن سے کسی توجہ و تائید کا مستحق نہ سمجھا۔ مسلمانوں کی اس قدیم قیادت کا ذکر کرتے ہوئے اُنہوں نے **البلاغ** میں لکھا تھا کہ

" ان لوگوں نے اپنی تقلید اور پرستش کا ایک نیا بُت بنایا ہے اور اُس کا نام رکھا ہے "سرسید کی پالیسی"۔ یُونانی علم الاصنام میں ہر طاقت کے لئے ایک مخصوص بُت ہوتا تھا یہ نہیں ہوسکتا تھا کہ رزق کا دیوتا علم کے دیوتا کے کاموں میں مداخلت کرے یا کیوپڈ وینس کی حکومت میں خلل ڈالے۔ لیکن ان لوگوں نے صرف ایک ہی بُت بنایا ہے اور اُس

کے اختیارات اتنے وسیع ہیں کہ علم و عمل کا کوئی گوشہ اُس سے خالی نہیں"۔

پھر جو وقتاً فوقتاً **مولانا** اس مکتب خیال پر تنقید کرتے رہے اُس نے عوام کے خیالات کو بہت متاثر کیا اور رفتہ رفتہ دنیا کے حالات نے بھی علیگڈھ کی تحریک کو بہت کمزور کر دیا اور سیاسی قیادت تو بہت جلد اُس کے دائرے سے نکل گئی۔

اُسی زمانہ میں ہندی مسلمانوں کی اجتماعی زندگی میں صحافت کے اُفق پر **محمد علی** بھی نمودار ہوئے۔ وہ اُس وقت "مولانا" نہ تھے بلکہ علی گڈھ کی تعلیم یافتہ نسل اور علی گڈھ کی روایات کے نمائندے تھے۔ درحقیقت **کامریڈ** کا مسلک **علیگڈھ** کی سیاسی تحریک کے ساتھ ساتھ تھا۔ مگر **الھلال** کی راہ **کامریڈ** سے بالکل مختلف تھی۔ **مولانا** اُس وقت **علی گڈھ** کے مسلک سے کس قدر دُور تھے اِس کی ایک مثال اجوُدھیا میں قربانی گاؤ کا مسئلہ تھا جس پر **مولانا** نے عام مسلمانوں کے جذبات کے خلاف اپنی رائے ظاہر کی حتیٰ کہ اُن کے دوست **حکیم اجمل خان** کو بھی جو اُس وقت علی گڈھ کی تحریک کے حامی تھے **الھلال** کی رائے کے خلاف آواز اُٹھانی پڑی۔ ملک کی صحافت میں اس بحث کا لہجہ بہت تلخ ہو گیا۔ اور مولانا **محمد علی** سے بھی **مولانا** کے نظریات کا غالباً یہ پہلا تصادم تھا۔ اس کے بعد تو متعدد قومی مسائل میں یہ اختلاف رائے نمایاں ہوتا رہا۔ **کامریڈ** ہمدرد اور **الھلال** کے صفحات پر اُس وقت کے ان

مباحث کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ ایک بڑا معرکہ مجوزہ مسلم یونیورسٹی کے مسئلہ پر پیش آیا، جب لکھنؤ میں فاؤنڈیشن کمیٹی کا جلسہ منعقد ہوا اور اس نے طے کیا کہ ویسرائے کے پاس ایک وفد جائے اور مجوزہ یونیورسٹی کے متعلق حکومت کی شرائط کو قبول کر لیا جائے۔ **مولانا** خود اُس جلسہ میں شریک تھے۔ اُس کی روئداد پر جو تبصرہ **الہلال** کے ادارتی کالموں میں شائع ہوا اُس سے صحیح اندازہ ہوتا ہے کہ اُس وقت مولانا **محمد علی** اور علی گڈھ کے لیڈروں کے طرزِ عمل کے متعلق **مولانا** کے احساسات کس قدر گرم اور تلخ تھے اور اِن دونوں کے درمیان فاصلہ کتنا زیادہ تھا۔ اس سلسلہ مضامین کی جس کا عنوان "حدیث الغاشیہ" تھا چند سطور نقل کی جاتی ہیں تاکہ ان اوراق کے پڑھنے والوں کو اُس دور کی اسلامی قیادت سے **مولانا** کے اختلاف کا کچھ اندازہ ہو سکے۔ لکھنؤ کے جلسہ کی روئداد پر تبصرہ کرتے ہوئے **مولانا** نے کہا تھا کہ:-

کہا جاتا ہے کہ راجہ صاحب (راجہ صاحب محمود آباد جو اُس وقت مسلمان قائدین کی صفِ اوّل میں تھے) نے کہا تھا کہ جب تک مسٹر محمد علی راضی نہ کئے جائیں گے کچھ نہ ہوگا (محمد علی اُس وقت تک حکومت کی مجوزہ شرائط کو قبول کرنے پر آمادہ نہ تھے) یہی سبب ہے کہ اُس خلوت شب کی بارات کا دولہا اُن ہی کو بنایا گیا اور رات بھر سہرے کی تزئین و آرائش میں صرف ہوگی خیر ہم کو اس سے کوئی بحث نہیں کہ رات بھر کی بیداری خلوت

میں کیا کچھ کیا گیا۔ ہم تو صبح کی چشمِ خمار آلود اور زلفِ پریشاں کی ادائیں دیکھنے والوں میں تھے۔ اور یہ جو اپنے حصہ میں آیا اس پرشا کی بھی نہیں، ہمارے دوست کے ہم وطن بلکہ اُن کے رئیس (نواب یوسف علی خاں ناظم) کا فلسفہ اس موقعہ کے لئے ہمیں یاد تھا:۔

اَدائیں شب کی تو سب لوگ دیکھتے ہیں مگر
ہم اُن کی بگڑی ادائیں سحر کو دیکھتے ہیں

....

یہاں تک کہ صبح کو صدہا نظر ہائے منتظرہ اور صدا ہائے مضطرب کی صفوں سے گذرتی ہوئی " اربابِ حل وعقد" کی قطار جلوہ فروش ہوئی اور " حجلہ سازش " کے تمام " عروسانِ شب زندہ دار " ایک ایک کرکے نظرافروزِ بزم وانجمن ہوئے، چہروں نے پہلے ہی نظر میں اربابِ نظر سے رمز فروشی کی کہ رات بھر میں رنگ بدل چکے ہیں:۔

شب تو شراب خوردہ با تو صدنشانی ہاست!

ان ہی میں ہمارے شیوہ طراز دوست مسٹر **محمد علی** ہی تھے۔ صحبت نیم شبی کا خمار آنکھوں میں اور شب بیداری کی افسردگی چہرہ پر۔ جی میں آیا کہ بڑھ کر پوچھیں کہ

توشبانہ می نمائی بہ برے کہ بودی امشب
کہ ہنوز چشمِ مستت اثرِ خمار دارد!

. . . .

"۲۶ر کی سہ پہر کو ہمارے دوست کا مزاج بہت گرم تھا۔ اُن کی تقریر اتنی پُرجوش تھی کہ اُس کی بے اعتدالی ہم کو بھی ناگوار گذری اور اُن کے کان میں کہا کہ خدا را ذرا لب ولہجہ نرم کیجیئے .... لیکن آج اُن کی تقریر اتنی ٹھنڈی تھی کہ پرسوں جن لوگوں نے اُن کے جوش کے انگارے سے اپنی انگیٹھیاں گرم کی تھیں آج اُن کو آغاز تقریر ہی سے جماہیاں آنے لگیں .... سب سے پہلے ہمارے دوست نے قسمیں کھانا شروع کیں کہ مجھ پر خدا کے لئے اعتماد کیجیئے۔ لیکن وہ بھول گئے کہ زیادہ قسمیں کھانا کوئی اچھی علامت نہیں سمجھی جاتی گو اچھی علامت ہو۔

• قسم سچی سہی پھر بھی ضرورت کیا ہے کھانے کی!

ہمارے دوست کو معلوم نہیں کہ اعتماد حاصل کرنے کا ذریعہ قسموں اور عہد و پیمان میں نہیں ہے بلکہ کسی اور چیز میں ہے۔ سچا اعتماد پیدا کرانے والوں نے کبھی خود قسمیں نہیں کھائی ہیں۔ بلکہ اپنی استقامت اعمال کے زور سے اعتماد کی قسمیں دنیا سے لی ہیں۔ اس نکتہ کو خانخانان نے سمجھا تھا۔

بہ کیش صدق و صفا حرف عہد بیکار است
نگاہ اہل محبت تمام سوگند است "

اس کے بعد ان دو زبردست شخصیتوں میں بار بار تصادم ہوتا رہا، لیکن **مولانا** کا پلّہ اس لئے بھاری رہتا تھا کہ علم وفضل کا وہ وزن مولانا **محمد علی** کی شخصیت کو حاصل نہ تھا جس نے **مولانا** کے قلم کو قوت بخشی تھی۔ بہرحال افکار اور نظریات کی یہ ابتدائی آویزش کم وبیش ساری عمر ان دونوں کے درمیان باقی رہی۔ تحریک خلافت کے زمانہ میں کسی حد تک **علی برادران** اور **مولانا** کے درمیان اتحاد عمل قائم رہا لیکن اس کے باوجود نظریات اور آئیڈیل کا اختلاف ایسی چیز نہ تھا کہ مٹ سکتا۔ اسی کے ساتھ مزاج کا اختلاف بھی ایک بڑا اختلاف تھا۔ **مولانا** کی زندگی کا پس منظر اُن کا خاندانی تقدس تھا اور اسی سانچہ میں اُن زندگی ڈھل چکی تھی۔ مولانا **محمد علی** کی فطرت کا سانچہ دوسرا تھا۔ وہ علی گڈھ کے بیباک "کہلنڈرے دل" کا سانچہ تھا۔ اس لئے دونوں کے درمیان کوئی ایسی چیز مشترک نہ تھی جو دیرپا ہم آہنگی پیدا کرسکتی۔ چنانچہ تحریک خلافت کے ختم ہوتے ہی دونوں کے راستے علانیہ جدا ہوگئے اور پھر کبھی وہ ایک نقطہ خیال پر جمع نہو سکے

پنڈت جواہر لال نہرو نے Discovery of India میں **الہلال** کا ذکر کرتے ہوئے بہت جامع الفاظ میں اُس کی امتیازی خصوصیات کا تجزیہ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ:۔

ابوالکلام آزاد نے اپنے ہفتہ وار اخبار **الہلال** میں اُن سے (مسلمانوں سے) ایک نئی زبان میں خطاب کیا۔ صرف اُن کے خیالات اور نقطہ نظر ہی میں جدت نہ تھی بلکہ اُن کی تحریر کا رنگ ہی نیا تھا۔ اُن کا اسلوب بیان جاندار اور پُرزور تھا....... اُن کا ذہن ایک معجون مرکب تھا۔ عہد وسطےٰ کے متکلمانہ خیالات، ۱۸ ویں صدی کی **عقلیت** اور عہدِ حاضر کے علمی رحجانات کا .... **ابوالکلام آزاد** نے قدامت پرستی کے قلعہ پر حملہ کیا، یہ حملہ براہ راست نہیں بلکہ ایسے خیالات کی ترویج و اشاعت کے ذریعہ سے کیا گیا جنہوں نے علیگڈھ کی روایات کی بیخ کنی کر دی۔ نوجوان مصنف اور اخبار نویس نے مسلمانوں کے تعلیم یافتہ حلقہ میں ہلچل مچا دی، اگرچہ بوڑھوں نے بہت تیوری چڑھائی مگر نوجوانوں کے دلوں میں ایک ہیجان برپا ہوگیا۔"

الہلال کے اجراء کے چند ہی روز بعد مولانا **محمد علی** نے بھی دہلی سے روزنامہ **ہمدرد** جاری کیا۔ اُس کے دائرہ اثر میں وسعت تو بہت تھی لیکن گہرائی اتنی نہ تھی جتنی کہ **الہلال** کے اثر و نفوذ میں۔ اس کا سبب غالباً یہ تھا کہ **مولانا** کے قلم کی ادبی خصوصیات جس کے زور کو مولانا محمد علی بھی تسلیم فرماتے تھے، اور اُن کے پیام کی مذہبی نوعیت ایسی تھی کہ وہ عوام کے قلوب میں زیادہ گہرائی تک جگہ پاتی تھی اسی لئے

الہلال نے اپنی مختصر زندگی میں عوامی افکار کے ایسے نقشے بنا دئے جو نہ صرف سیاسی بلکہ اخلاقی اہمیت رکھتے تھے اور اسی لئے تعلیم یافتہ گروہ سے زیادہ مسلم عوام کے لئے دلپذیر تھے۔ **الہلال** کے صفحات پر بعض بہت اہم قومی اور مذہبی مسائل زیر بحث آتے رہے جنہوں نے ملتِ اسلامی کے ذہنی نقشوں کو بالکل بدل دیا۔ اس انقلاب میں بلاشبہ بڑا حصہ **مولانا** کے زورِ قلم اور اسلوب بیاں کا بھی تھا۔ اصلاح ندوہ کی بحث، اخبار زمیندار کی ضبطی ضمانت، اور صحافت کی آزادی کا مسئلہ، اور سب سے زیادہ مسجد کانپور کے انہدام کا حادثہ اور جنگ بلقان اور ممالک اسلامی کے متعلق خبروں اور مضامین کا سلسلہ اور ایسے ہی بہت سے مباحث تھے جن سے **مولانا** نے اپنی قوم کے احساسات کی صحیح سمت میں رہنمائی کرنے کے لئے ایک وسیع میدان پیدا کیا۔ خالص مذہبی موضوعات پر بھی **مولانا** کی وسعت نظر مسلم عوام کے لئے ایک نئی چیز تھی۔ مثلاً "الدین والسیاست" "الاصلاح والافساد" "فلسفہ اجتماع اور جنگ" "جنگ کا اثر فن روایت پر" "تربیت عسکری اور قرآن" اور ایسے ہی صدہا مستقل مضامین کے ساتھ ہی ساتھ ہزارہا استفسارات کے وہ جوابات ہیں جن میں **مولانا** اسلامی نقطہ نظر کی وضاحت فرماتے تھے۔ مثلاً حجت ابراہیمی" "اسلام اور سزائے قتل" "کفار اور کفر کی نوعیت" "مذہبی حملوں کی روک تھام" اور سینکڑوں ایسے سوالات جن کے جواب میں **مولانا** کوئی فتویٰ دینے کے بجائے

اپنا عقلی اور استدلالی نقطہ نظر پیش فرماتے تھے۔ اور وہ سننے والوں اور پڑھنے والوں کے دلوں میں اُتر جاتا تھا۔ مذہب اخلاق اور فلسفہ حیات کا یہ ایک نیا نقشہ تھا جو اُنہوں نے منظر عام پر پھیلایا اور اس میدان میں اُن کا ہمعصر اور ہم پلّہ کوئی نہ تھا۔ اِن مباحث میں **مولانا** قدیم مفسرین اور متکلمین کے طریق استدلال سے ہٹ کر اپنی اجتہادی قوت کو اس طرح واضح کرتے تھے کہ ہر قدم پر اُنہوں نے تقلید کی زنجیریں توڑیں اور صاف صاف فرمایا کہ

"دنیا کی کوئی تعلیمی صداقت بھی ایسی نہیں ہے جس کے پیرؤں کا فہم و عمل حجت قرار دیکر ہم حقیقت کی طرف قدم بڑھا سکتے ہوں"............ وہ تمام لوگ جو حقیقت و صداقت کے متلاشی نہیں ہوتے بلکہ کسی خاص خیال اور جذبہ سے اپنی کوئی بات منوانی اور دوسرے کی کوئی بات گرادینی چاہتے ہیں طریق "جدل" پر عامل ہوتے ہیں........ ہمیشہ اس ڈھونڈھ میں لگے رہتے ہیں کہ کسی نہ کسی طرح اپنی بات منوادیں مذاہب عالم کے پرجوش حامیوں مذہبی مجالس کے زبان دراز مناظروں اور مذہبی بحث و نظر کے بنائے ہوئے نام نہاد علوم میں دسترس رکھنے والوں کا غالب حصہ اسی طریق جدل کی پیداوار ہے............ مذاہب کی تعلیم اور پیروان مذاہب کا فہم و عمل دو مختلف چیزیں ہوگئی ہیں ایک

چیز نہیں ہے۔"

اس طرح مولانا نے الہلال اور البلاغ کے ذریعہ سے مذہب اور اخلاق کے معاملہ میں بھی عقل اور دماغ کے بند دروازے کھولے اور اُن کی آواز عوام کی زندگی میں گونجی۔

جہاں تک سیاست کا تعلق ہے گذشتہ نصف صدی میں ہندستان کی سیاست کے راستے پر دو موڑ ایسے آئے جہاں انقلابی قوتیں بیدار ہوئیں۔ پہلا موڑ تو وہی حادثہ مسجد کانپور تھا اور دوسرا جلیانوالہ باغ کا قتل عام۔ مسجد کانپور کا انہدام گویا ایک شدید ٹھوکر تھی جس نے علیگڈھ کی قدیم سیاست کو مسمار کردیا اور اسی نقطہ سے مولانا نے بھی اپنی ملت کے لئے طلب حق کا ایک راستہ معین کیا۔ مسجد کانپور کے انہدام کا ذکر کرتے ہوئے مولانا نے اپنے ایک اداریہ میں لکھا تھا کہ:۔

"تعجب ہمیشہ اس واقعہ پر ہوتا ہے جو نادر و غریب ہو اور شکایت ہمیشہ اُس سے ہوتی ہے جس سے توقع ہو۔ مجھکو تو نہ اُس واقعہ پر تعجب ہوا اور نہ شکایت پیدا ہوئی۔ میرے سامنے تاریخ ہے اور قوموں کی سرگذشتیں ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ طاقت نے ہمیشہ غرور کیا ہے اور حکومتوں نے ہمیشہ حق و حیات کے سائلوں کو ایسا ہی جواب دیا ہے۔ میں روز اول ہی سے جانتا تھا کہ یہ سب کچھ یکے بعد دیگرے ہونے والا ہے اور وقت اور موسم کے تغیر کا انتظام کیا جارہا ہے۔"

جو آگ اُس وقت لگی ہوئی تھی **مولانا** نے اُسی کے انگاروں سے اپنی قوم کے دلوں کے آتش خانوں کو گرم رکھنے کی کوشش کی:-

"وقت نازک ہے اور موسم مخالف ہے، غفلت کے جھونکے چلنے لگے ہیں اور جھنجوڑنے والے ہاتھ بے حرکت ہو گئے ہیں، حریف قوی و شاطر، مقابل فریب خوردہ، وساوس و مطامع دلفریب اور ایمان کی آزمائش امتحان طلب ہے۔ سفر ابھی شروع ہی ہوا ہے اور تجربہ کی زادِ راہ سے مسافر تہی دست ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ قدرت کی بخشی ہوئی ایک ہی فرصت ہشیاری ضائع کر دی جائے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ جو برسوں کی جگہ مہینوں میں حاصل ہوا تھا پھر غفلت و سرشاری پر قربان کر دیا جائے۔۔۔۔۔"

ہر ایسے قومی حادثہ کو **مولانا**، **الہلال** کی دعوت کا پس منظر بنا لیتے تھے اور جب تک **الہلال** جاری رہا وہ اُس کے صفحات پر اپنا پیام دہراتے رہے:-

"آج ڈیڑھ سال گذر گیا اور میں تمہارے سامنے ہوں۔ میں نے ہمیشہ اپنی فریادیں بلند کی ہیں اور ہمیشہ وہ سب کچھ تم کو بتلا دینا چاہا ہے جو میرے دل نے مجھے بتلایا ہے۔ میں تم سے سچ سچ کہتا ہوں کہ میں نے کبھی بھی حق کے کہنے میں تامل نہیں کیا اور کبھی بھی میرا نفس اپنے فوائد اور اپنے ذاتی تحفظ کے مطامع دکھلا کر مجھے رام نہ کر سکا۔ میرے آگے دنیوی عزت کے حصول

اور دولت وجاہ سے مالا مال ہونے کی بہت سی راہیں آئیں اور اگر میں صرف تھوڑی سی غیر محسوس تبدیلی بھی اپنی روش میں کر دیتا تو حق پرستی کے دعوؤں کو باقی رکھ کر بھی دنیا حاصل کر سکتا تھا۔ پر خدا نے میرے دل کو ہمیشہ اپنی قدوس انگلیوں میں اس طرح رکھا کہ چند لمحوں کے فانی تزلزل کو مستثنےٰ کر دینے کے بعد میں اُس کے تختِ عظمت وجلال کی قسم کھا سکتا ہوں کہ میں نے کبھی اپنے ذاتی فائدے کے لئے اپنی روش سے ایک رائی برابر اعراض پسند نہیں کیا اور میرے دل کے سچے ناز اور جائز فخر کے لئے یہ بس کرتا ہے کہ مجھے حق کی پرستش کی توفیق ملی۔ میں نے کبھی نصیحت کرنے میں خیانت نہ کی اور آئندہ کی مادی عقوبتوں کا تصور میرے لئے کبھی بھی مہیب نہیں ہوا۔ میں نے اکثر وقت سے پہلے غفلت کو دور کرنا چاہا اور اکثر عین وقت پر بیدار کرنے کی کوشش کی۔ آج بھی میں حالت کو دیکھ رہا ہوں اور خاموشی کو گناہ اور اعراض کو کفر سمجھتا ہوں کیونکہ نتائج قریب اور آنے والا وقت موجودہ سے زیادہ آزمائش طلب ہے۔ میں آج پھر اپنی صدا بلند کرتا ہوں اور ہر شخص کو جو ملت کا درد، زندگی کی خواہش اور حاصل کردہ متاع کے ضائع نہ ہونے کا خواہشمند ہے اپنے دل کے درد اور دُکھ کی آواز میں دعوت دیتا ہوں . . . "

دل کے درد اور دکھ کی یہ آواز الہلال کے ہر صفحہ کی ہر سطر میں بلند ہوتی رہی۔ ان اوراق میں اتنی گنجائش نہیں کہ الہلال کی "دعوت" پر تفصیلی تبصرہ کیا جاسکے۔ مولانا کے خیالات اور عزائم کے جو گوشے اُن اوراق پر ظاہر ہوتے رہے اُن کی توضیح کے لئے ہزارہا صفحات کی ضرورت ہے۔ اشارتاً اُس تحریک کا تھوڑا سا ذکر کیا جاتا ہے۔ جو "من انصاری الی اللہ" کے عنوان سے الہلال کے صفحات پر پیش کی گئی تھی تاکہ مولانا کی ذہنی جد وجہد کا ایک خاص رُخ نمایاں ہوجائے، فرماتے ہیں کہ:-

"میرے اعتقاد میں پہلی چیز کاموں کی تلاش نہیں ہے بلکہ کام کرنے والوں کی تلاش ہے۔ دنیا میں کاموں کی کبھی کمی نہیں رہی اصل کمی کام کرنے والوں کی ہے۔ موجودہ زمانہ اسلام پر ایک جنگ کا دور ہے۔ ہمارے اندر بھی اور ہم سے باہر بھی۔ دشمنوں کا ہر طرف ہجوم ہے اور کوئی گوشہ نہیں جو حملہ آوروں کے اسلحہ کی جھنکاروں سے خالی ہو۔ پس جو لوگ اپنے اندر ایک سپاہی کا جوش اور ایک جانباز کی ہمت رکھتے ہیں اُن کے لئے میدان کار کی کوئی کمی نہیں ہے۔ وہ مستعد ہوکر باہر نکلیں۔ پھر کونسا گوشہ اسلامی ہے جو آج اپنے جانبازوں کے ورود کا منتظر نہیں کونسا میدان ہے جہاں سے اجیبو داعی اللہ کی صدائیں نہیں

آرہی ہیں۔ پس قبل اس کے کہ میں اپنے کاموں کا معرکہ زار دکھلاؤں چاہتا ہوں کہ معلوم کروں کہ کتنے سپاہی مستعد پیکار ہیں اور کتنے ہیں جو آج اپنے خدا اور اپنی ملت کو اپنی زندگی اور اپنی قوت کا کچھ حصہ دے سکتے ہیں۔ میں بہت جلد اپنی تحریروں میں اپنی تجویزوں کی ایک اسکیم پیش کر دوں گا لیکن پہلے مجھے جواب دیجئے کہ کتنے ہیں جو آج اپنے تئیں خدا کو دے دینے کے لئے بالکل مستعد ہیں۔

پھر کہتا ہوں کہ آج جبکہ ہماری قومی زندگی کا کوئی شعبہ بھی نہیں جو محتاج احیا نہ ہو کاموں کی کوئی کمی نہیں، کمی صرف مجاہدین حق اور جاں نثاران ملت کی ہے۔"

الہلال کی تحریک اور" دعوت" کے متعلق مختلف مواقع پر **مولانا** جو کچھ لکھتے یا فرماتے رہے اُس سب کا ان اوراق میں جمع کرنا مشکل ہے لیکن چند روز بعد جب ہندستان میں ایک استبدادی حکومت کی دارو گیر شروع ہوئی تو **مولانا** نے اپنی" دعوت" کے ہر رُخ کو زیادہ سے زیادہ واضح کرنا شروع کر دیا۔ کلکتہ کی عدالت میں اُنہوں نے اپنا جو مشہور بیان تحریری پیش کیا اُسمیں **الہلال** کی تحریک اور اُسکے نتائج کا اس طرح ذکر فرمایا:۔

"الہلال نے تین سال کے اندر مسلمانانِ ہند کی مذہبی اور سیاسی حالت میں ایک بالکل نئی حرکت پیدا کر دی۔ پہلے وہ اپنے ہندو

بھائیوں کی پولٹیکل سرگرمیوں سے نہ صرف الگ تھے بلکہ اُس کی مخالفت کے لئے بیروکریسی کے ہاتھ میں ایک ہتھیار کی طرح کام دیتے تھے۔ گورنمنٹ کی تفرقہ انداز پالیسی نے اُنہیں اس فریب میں مبتلا کر رکھا تھا کہ ملک میں ہندوؤں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ ہندستان اگر آزاد ہوگیا تو ہندو گورنمنٹ قائم ہوجائے گی۔ مگر الهلال نے مسلمانوں کی تعداد کی جگہ ایمان پر اعتماد کرنے کی تلقین کی اور بیخوف ہوکر ہندوؤں سے مل جانے کی دعوت دی۔ اس سے وہ تبدیلیاں رونما ہوئیں جن کا نتیجہ آج متحدہ تحریک خلافت وسوراج ہے......

میں بتلانا چاہتا ہوں کہ الہلال تمامتر "آزادی یا موت" کی دعوت تھی۔"

الہلال اور **البلاغ** کے ۱۵ء میں بند ہوجانے کے بعد بھی **مولانا** کی دعوت کا یہ رخ ہندستانی مسلمانوں کی زندگی میں عرصہ تک نمایاں رہا۔ لیکن وہ رفتہ رفتہ **کانگریس** کے بنیادی مقاصد کا ایک جزو بن گیا اور خود **مولانا** کانگریس کے ایک رہنما کی حیثیت سے کام کرنے لگے۔ رضاکاروں اور جانبازوں کی جو تنظیم **مولانا** کے پیش نظر تھی وہ کچھ تو اس لئے روبہ کار نہ آسکی کہ سیاسی انقلابات کا سیلاب بہت تیز تھا اور ہر روز سیاسی میدان کا نقشہ بدلتا رہتا تھا اور کچھ اس لئے بھی کہ تحریک خلافت میں ہندو مسلم اتحاد کی تعمیر کے بعد کسی جداگانہ تنظیم کی ضرورت باقی نہ رہی تھی۔ اس تحریک کے

سلسلہ میں **مولانا** کی نفسیات کا ایک اور پہلو بھی نظر کے سامنے آتا ہے جس پر "**نقش ثانی**" میں بحث کی گئی ہے۔ اس موقعہ پر تو اتنا ہی اشارہ کافی ہے کہ یوں تو **مولانا** کے علم وفضل، اُن کے عزم و استقامت، اُن کی عمر بھر کی قربانیوں اور اُن کے افکار کی وسعتوں سے انکار کرنیکی جرأت سوائے اُس شخص کے کوئی نہیں کر سکتا جس نے عقل سلیم سے اپنا حصہ نہ پایا ہو۔ لیکن **مولانا** کی زندگی میں جو عنصر کم آمیزی اور ذہنی خلوت پسندی کا ہے وہ اکثر اوقات اُن کے افکار کے معیار کو اس قدر بلند اور عوام کی دسترس سے بھی بعید کر دیتا ہے کہ کبھی بھی دو چار مخلصین سے زیادہ ایسے کام کرنے والے اُن کے قریب جمع نہ ہو سکے جو اُن کے معیار پر پورے اُترتے یا اُن کا اعتماد حاصل کر سکتے۔ اس لئے اکثر ایسا ہوا کہ وہ اپنی کشتی کے خود ہی ملاح بھی رہے اور مسافر بھی۔ **مولانا** کی یہ خصوصیت اب تو پہلے سے بھی زیادہ نمایاں ہے اور اسی لئے عمومی زندگی کے میدان میں آج بھی بہت سے دوسرے لیڈر مولانا کے شانہ سے شانہ ملا کر نہیں چل سکتے۔ اس کتاب کے دوسرے جزو میں **مولانا** کے ادب پر جو تبصرہ کیا گیا ہے اُس میں **مولانا** کی اُن ذہنی اور نفسیاتی کیفیات کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

(۶)

سنہ ۱۹۱۱ء میں تقسیم بنگالہ کی تنسیخ نے مسلمانوں کی قدیم سیاست پر ایک

سخت ضرب لگائی۔ تقسیم بنگالہ کی بڑی مصلحت یہی تھی کہ ایک طرف تو غیرمسلم بنگالیوں کی قوت واکثریت کو توڑا جائے جنہوں نے انگریزی اقتدار کے خلاف ایک محاذ بنالیا تھا اور دوسری طرف وفادار وعقیدتمند مسلمانوں کو خوش کردیا جائے جن کے لئے ایک نئے صوبہ میں پوری پوری اکثریت پیدا کردی گئی تھی۔ انگریزی سلطنت کے اندرونی مصالح اور انگریزی سیاست کے انداز تدبر پر اگر گہری نظر رکھی جائے تو آج تقسیم ہندستان کی اغراض بھی تقسیم بنگالہ سے مختلف نہیں معلوم ہوتیں۔ البتہ اس دفعہ اس عمل کا پیمانہ بڑا ہے!
لیکن تقسیم بنگالہ کے وقت بیدار بنگالیوں اور حقوق طلب جماعتوں کی جدوجہد کے مقابلہ میں انگریز کے اس منصوبہ نے شکست کھائی تھی۔ ہندستان میں انگریز کے تدبر کی یہ پہلی شکست تھی۔ افسوس یہ ہے کہ باوجودیکہ بنگالیوں کی جدوجہد کا نتیجہ اس قدر واضح اور غیرمبہم تھا لیکن اُس وقت بھی مسلمان یہ بات نہ سمجھ سکے کہ مطالبہ حق کی قوت کس قدر بے پناہ ہوتی ہے۔ اور انگریز کی بساط پر کس طرح وہ بے جان مہرے بنائے گئے ہیں کہ جس مہرے کو جب چاہا اور جہاں چاہا ہٹالیا یا رکھدیا۔ تقسیم بنگالہ کی تنسیخ کے بعد بھی ہندستانی مسلمانوں کی قیادت انگریزی حکومت کے دامن سے لپٹی رہی اور زیادہ سے زیادہ جو وہ کرسکی صرف یہ تھا کہ کچھ نیازمندانہ گلہ شکوہ کے بعد سنگ آمد سخت آمد کی مصداق مایوسیوں کو بھی برداشت کرلیا گیا۔
جس وقت مسلمان لیڈر انگریزی تدبر کی اس ضرب کے بعد اپنی چوٹوں

کو سہلا ہی رہی تھے کہ جنگ بلقان اور مصر و ترکی کے فتنوں نے انہیں بہت آزردہ خاطر کردیا۔ یہی زمانہ تھا جب **مولانا** کی بے پناہ شخصیت پوری قوت کیساتھ **الہلال** کے صفحات پر نمایاں ہوئی۔ خود مسلمانوں کی قدیم قیادت کے مقابلہ میں نئی نسلوں کے کچھ باغی عناصر ظاہر ہونے لگے۔ چنانچہ لندن کی **مسلم لیگ** نے برخلاف مرکزی **مسلم لیگ** کے بعض تعلیم یافتہ نوجوانوں کے زیر اثر یہ تجویز پیش کردی کہ اب مسلمانوں کو کانگریس میں شریک ہوکر برطانوی سامراج کا مقابلہ کرنا چاہیئے۔ آج ماضی کے اُن دھندلے نقوش کو اُجاگر کیا جائے تو حیرت ہوتی ہے کہ اُس زمانہ میں خود مولانا **محمد علی** نے **کامریڈ** کے صفحات پر لندن لیگ کی اس تجویز کی مخالفت کی تھی!۔ تاہم مسلمانوں میں **بدرالدین طیب جی**، **رحمت اللہ سیانی** **نواب سید محمد** اور متعدد ایسے مسلمان لیڈر موجود تھے۔ جنہوں نے اس تجویز کی تائید کی اور عجیب بات یہ ہے کہ لکھنؤ کے علماء کی جماعت میں بھی بعض ایسے اصحاب نکل آئے جنہوں نے لندن لیگ کی اس تحریک کا ساتھ دیا۔ ان لوگوں کو **الہلال** کی آواز سے بھی بہت تقویت حاصل ہوئی۔ **مولانا** کے کردار کی یہ خصوصیت اُن کی زندگی میں ہر لمحہ نمایاں رہی ہے کہ پہلے دن سے جب اُنہوں نے کانگریس کے مسلک کی تائید کی آج تک وہ اپنے اُسی ایک اصول پر قائم رہے۔ ہندستان کے مسلمان احرار کی یہ جماعت جس کا ترجمان **الہلال** تھا بہت جلد پُرانی سیاست کے پُرانے نقشے کو بدلنے میں کامیاب ہوئی۔ مرحوم سیّد **وزیر حسن**

نے جو اُس وقت مسلم لیگ کے سکریٹری تھے۔ وقت کے تقاضوں کو محسوس کیا اور بالاخر ۱۳ء میں لیگ کے مقاصد اور اصولوں کا نقشہ اس حد تک تو ضرور بدل گیا کہ پہلی دفعہ لیگ کے پلیٹ فارم پر "سرکار" کی وفاداری کے ادعا کے پہلو بہ پہلو ہندستان کے لئے "موزوں حکومت خوداختیاری" کا نام بھی زبان پر آیا۔ **مولانا** نے اس وقت بھی لیگ کے اُس اجلاس میں اعلان وفاداری اور حکومت خوداختیاری کے ساتھ "موزوں" کی شرط پر اعتراض کیا تھا۔ اس اعتراض کے جواب میں مولانا **محمد علی** نے یہ توجیہ پیش کی تھی کہ اعلان وفاداری کا باربار دہرایا جانا اُسی طرح غیرضروری نہیں جس طرح کہ کلمہ طیبہ کا باربار پڑھنا! مگر زمانہ کے تقاضوں کی بے پناہ قوت آنیوالے وقت کا انتظار کررہی تھی اور یہ تو ہونا ہی تھا کہ آخر ایک دن ۱۳ء کا یہی **محمد علی** ۱۹ء میں سرکار کی فوج اور پولس کو جادہ وفاداری سے منحرف ہونے کی دعوت دیتا ہوا جیل خانہ جائے! زمانہ ایک ایسا استاد ہے جس کی درس وتدریس کے طریقے بھی نرالے ہوتے ہیں۔ اسکے شاگرد اس طرح اپنا سبق پڑھتے ہیں کہ اُنہیں اپنے ذہنی انقلاب کا احساس اُس وقت تک نہیں ہوتا جب تک کہ نامعلوم قوتیں زندگی کے سارے نقشے بدل نہ چکیں!

انگریزوں کی حکومت لیگ کی "وفاداریوں" کے اس اضمحلال کو تشویش کی نظر سے دیکھ رہی تھی اس لئے کہ مسلمانوں کی جداگانہ

سیاست ہی تو اُس کے تدبر کا سب سے بڑا مورچہ تھا۔ چنانچہ چند ہی روز بعد لیگی سیاست کے اِن گوشوں میں "سرکار" کی ریشہ دوانیاں شروع ہوگئیں اور وفاداران سرکار کی ان لغزشوں کی روک تھام شروع ہوگئی۔ حتیٰ کہ بالآخر وہ مورچہ پھر قائم ہوگیا اور اُسی مورچہ پر انگریز نے پھر اپنے سامراجی منصوبے قائم کئے اور آزاد ہندستان کے پہلو میں برطانوی سامراج کا ایک قلعہ "پاکستان" کے نام سے بالآخر قائم کرلیا۔

یوں تو **الہلال** کی اشاعت کے بعد ہی **مولانا** کے وجود کا کانٹا حکومت کی آنکھوں میں کھٹکنے لگا تھا، لیکن مسلم یونیورسٹی کے معاملہ میں مولانا کے طرزِ عمل اور خصوصاً انہدام مسجد کانپور کے سلسلہ میں **الہلال** کے مضامین نے صوبجات متحدہ کے گورنر کو بہت بےچین کردیا۔ چنانچہ **مولانا** پر پہلے وار کی تیاریاں شروع ہوگئیں۔ اور اس کے لئے زمین اس طرح تیار کی گئی کہ اخبار **پانیر** میں جو اُس زمانہ میں سرکار کا بہت معتمد ترجمان سمجھا جاتا تھا **مولانا** کے متعلق ایک بہت زہریلا مضمون شائع ہوا جس میں حکومت سے مطالبہ کیا گیا کہ اس مخالف حکومت "فتنہ" کا کچھ علاج کیا جائے۔ چنانچہ پہلے تو **الہلال** کی ضمانت ضبط کی گئی اور ۱۵ء میں **مولانا** بھی بنگال سے خارج البلد کردیے گئے۔ **الہلال** کا یہ انجام **مولانا** کی زندگی کے ایک نئے دور کا آغاز تھا۔

بنگال سے جلا وطن ہوکر **مولانا** رانچی گئے اور بعد میں وہیں نظر بند کر دئے گئے۔ **مولانا** کی زندگی میں یہ ایک ایسی تنہائی اور خاموشی کا دور تھا جسمیں بڑے بڑے لوگ بڑے بڑے کاموں کے لئے تیار ہوا کرتے ہیں۔ اس "اعتکاف" کی حالت میں **مولانا** نے اپنے عزائم کے نقشوں میں رنگ بھرا اور وہ اُس فیصلہ کن کش مکش کے لئے تیار ہوئے جس کا نتیجہ تیس سال بعد نکلنے والا تھا۔

رانچی کے اسی "اعتکاف" میں **ترجمان القرآن** کے تین حصوں میں سے دو مرتب ہوئے اور **مولانا** نے اپنے اجتہاد کی قوت کو قرآن کریم کے سمجھنے اور پہچاننے میں صرف کیا۔ **ترجمان** کے دُو حصّے تقریباً مکمل ہو چکے تھے جب یہ لطیفہ (یا اُسے حادثہ کہئے) پیش آیا کہ ایک دن رانچی کے ڈپٹی کمشنر نے یکایک **مولانا** کی قیام گاہ پر آکر تلاشی لی اور اس تلاشی میں **مولانا** کے جتنے بھی کاغذات و مسودات تھے وہ سب سرکار کی تحویل میں منتقل کر لئے گئے۔ نوکر شاہی کے "دائرہ علم و فضل" میں کوئی اللہ کا بندہ ایسا نہ تھا جو اُن مسودات کی چند سطریں پڑھکر یہ سمجھ سکتا کہ یہ تفسیر قرآن ہے یا کوئی باغیانہ رسالہ۔ لیکن "صاحب" کو تو اپنا فرض انجام ہی دینا تھا اور وہ صرف اتنا ہی تھا کہ جس کاغذ پر **مولانا** کے قلم نے کچھ بھی لکھا ہو اُس پر بحق سرکار قبضہ کر لیا جائے۔ اس موقعہ پر ایک اور لطیفہ یاد آتا ہے جو روزنامہ ہمدرد کے مضامین کے احتساب کے سلسلے میں خود راقم الحروف کو پیش آیا تھا۔ یعنی پنجاب کے ایک مسلمان ڈپٹی کمشنر

جو ہمدرد کے سنسر مقرر ہوئے تھے اس قدر محتاط آدمی تھے کہ کوئی اداریہ بھی اُن کو لکھ کر دیا جائے وہ اُس کی اشاعت نامنظور فرما دیتے تھے۔ آخر تنگ آکر ایک دن صرف چڑیا چڑے کی کہانی (جس طرح کہ وہ ہر ہندستانی کے گھر میں بچوں کو سنائی جاتی ہے) لکھ کر بطور اداریہ پیش کی گئی۔ وہ بھی نامنظور! سوال کیا گیا کہ جناب اس معمولی کہانی پر آپ کیا اعتراض کرتے ہیں؟ ارشاد ہوا کہ بھائی! یوں تو یہ مضمون بالکل سیدھا سادھا اور صاف ہے اور کوئی بات قابل اعتراض نہیں معلوم ہوتی لیکن (مسکرا کر) کیا معلوم اس سیدھی سادھی کہانی میں بھی آپ نے کچھ نمک مرچ بھر دیا ہو! ان بیچارے سنسر کو اندیشے اور خطرات اس قدر لاحق تھے کہ اُن کی رائے میں چڑیا چڑے کی کہانی کا شائع نہ ہونا ہی شائع ہونے سے بہتر تھا!!۔ اسی طرح انگریز کے محکمہ خفیہ کا وہ کارنامہ بھی دلچسپ تھا کہ اس کا کوئی ایجنٹ ریل کے ڈبہ میں سے **حکیم اجمل خاں** کے شاعرانہ کلام کے مجموعہ کا مسودہ چرا کر لے گیا۔ اُس بدبخت نے سمجھا کہ شاید اس شعر وسخن میں بھی بغاوت کا کچھ مواد ہاتھ آجائے! یہ ذہنی فضا تھی جس میں سرکار کے عمال کام کر رہے تھے، پس ظاہر ہے کہ **مولانا** کے قلم کی تو ہر سطر ایک "آلہ دھاردار" قرار دیکر ضبط کی گئی ہوگی۔ غرض یہ کہ اس طرح **ترجمان القرآن** کے تمام مسودات نے محکمہ ارتکاب جرائم کی کسی آہنی الماری میں جگہ پائی۔ نظربندی سے رہائی پانے کے بعد جب **مولانا** نے ان مسودات کو لینے کی کوشش کی تو وہ اس حالت میں

واپس آئے کہ اُن کا بڑا حصہ ضائع ہو چکا تھا۔ اب **مولانا** کو یہ مشکل کام ازسرنو انجام دینا تھا۔ **کارلایل** کی طرح جس نے "انقلاب فرانس" کے مسودات کو ضائع ہو جانے کے بعد محض اپنے ذہن اور حافظہ کے بل پر ازسرنو لکھ ڈالا تھا **مولانا** کے ذہن اور حافظ نے بھی سرکار کی مجرمانہ بد مذاقی کا کفارہ ادا کیا۔ چنانچہ رانچی سے روانہ ہونے سے پہلے ہی وہ ضائع شدہ جلدوں کو ازسرنو مرتب کر کے تفسیر کی تیسری جلد کا کام شروع کر چکے تھے۔

مولانا کے حیرت انگیز حافظہ کی لاتعداد مثالوں میں سے یہ تو صرف ایک ہی ہے۔ ورنہ جن لوگوں نے مولانا کو قریب سے دیکھا ہے وہ جانتے ہیں کہ اُن کے علم و فضل کو قدرت کے اس عطیہ نے چار چاند لگا دیئے ہیں۔ اپنی زندگی اور دوسروں کی زندگی کے بہت پُرانے واقعات کو بھی **مولانا** اس طرح بیان فرماتے ہیں گویا یہ کل کی بات ہے۔ جو کچھ اُنہوں نے کہیں پڑھا یا سُنا وہ اُنہیں بجنسہٖ یاد ہے۔ لیکن اس کمال اور اس عجوبہ کے دیکھنے والے بہت کم ہیں اس لئے کہ **مولانا** کی ذہنی خلوت اور اُن کی زندگی کے سربند حجرہ میں داخل ہونا تقریباً ناممکن ہے۔ عوامی زندگی میں **مولانا** کی فطرت کا عکس جو کچھ بھی دیکھا جا سکتا ہے۔ وہ اُن کی تحریروں تک محدود ہے۔ اور ان تحریروں کی اشاعت کا سلسلہ بھی بہت عرصہ سے بند ہے۔

(۸)

ہندوستان کی سیاست میں ۱۹ء سے ۲۱ء تک کا دور ایک غلام ملک کی زندگی کے نشیب میں اُس کے فراز کا ایک انقلاب انگیز منظر ہے۔ جس وقت ۲۰ء میں **مولانا** نظربندی سے آزاد ہوکر باہر آئے تو رولٹ ایکٹ کا نفاذ ملک میں آگ لگا چکا تھا اور **مہاتما گاندھی** اپنے عدم تشدد اور عدم تعاون کے تمام ساز و سامان کے ساتھ میدان میں آچکے تھے۔ جس وقت **جلیانوالہ باغ** کے دروازے پر جنرل ڈائیر نے اپنی فوج کے رائفلوں اور کلدار توپوں سے برطانوی اقتدار کے استحکام کی ایک آخری کوشش کی تو اُس کے ساتھ ہی ملک میں ایسا طوفان آیا جس کے جوش و خروش کی کوئی مثال ۵۷ء کے بعد نہیں دیکھی گئی تھی۔ ۵۷ء کے تشدد کو اب مہاتما گاندھی نے اپنے اہمسا سے بدل دیا تھا اور یہ ایک ایسا اخلاقی حربہ اُنہوں نے ایک غلام قوم کے ہاتھ میں دیا تھا جس کی قوت کا کوئی اتنا بڑا مظاہرہ اس سے پہلے دنیا کے کسی ملک میں نہ ہوا تھا۔ اُس وقت **گاندھی جی** نے اپنی قوم کے اندر خیالات ارادوں اور جذبات کا جو بے پناہ ہیجان پیدا کر دیا وہ ایک ایسی اخلاقی اور روحانی مہم تھی جس کے مقابلہ میں قدیم انگریز پرستی کے بہت سے زاویے مسمار ہو گئے۔ خود مولانا **محمد علی** جو اپنی زندگی کے ابتدائی

دور میں علی گڈھ کے سیاسی مسلک کے ہمنوا تھے اب صاف صاف کہنے لگے کہ :-

"یہ کام جنرل ڈائیر ہی کے لئے مخصوص رکھا گیا تھا کہ وہ اُس دیوار کو گرادے جو عارضی مصالح کے تحت سرسید احمد خاں نے تیس سال پہلے کھڑی کی تھی اور اس کام کا سہرا جنرل ڈائیر ہی کے سر ہے کہ انہوں نے ۱۹ء کی کانگریس میں ہندستان کے مسلمانوں کو ایک مشترکہ قومیت کے علمبردار کی حیثیت سے شرکت کی ترغیب دی۔ اُس کے سپاہیوں کی گولیوں نے ہندو اور مسلمانوں کا کوئی امتیاز قائم نہ رکھا اور یقیناً قدرت نے یوں ہی مقدر کیا تھا کہ ایک ایسی قوم بھی جو مسلمانوں سے بھی زیادہ انگریزوں کی وفادار تھی (ہمارے سکھ بھائی) اپنے مذہب کے مقدس شہر امرتسر کو ہندوں اور مسلمانوں کے ساتھ ساتھ خود اپنے خون سے بھی رنگین کر دیں۔ اس واقعہ میں خدا کا ہاتھ تھا۔"

درحقیقت مولانا **محمد علی** کی زندگی میں راستہ کا یہی سب سے اہم موڑ تھا جہاں وہ علی گڈھ کی قدیم اور معتدل اور ٹھنڈی سیاست سے اپنا رُخ بدل کر اس میدان کی طرف آئے جہاں شاعر کہتا تھا کہ

دل و دیں نقد لا ساقی سے گر سودا کیا چاہے
کہ اس بازار میں ساغر متاع دست گرداں ہے

حالات کا جو ردعمل ہو رہا تھا اسی کے ساتھ ساتھ جب برطانیہ نے ترکوں کو بھی دنیا سے مٹا دینے کا ارادہ کرلیا اور **گلیڈسٹن** کے خواب کی تعبیر حاصل کرنی چاہی اور اسلامی اماکن مقدسہ کے لئے بھی ہر طرف سے خطرات پیدا کر دیئے گئے تو ہندستان میں **جلیانوالہ باغ** کے خون کا رنگ زیادہ گہرا ہوگیا اور **علی برادران** تحریک خلافت کا علم بلند کرکے مہاتما جی کے پہلو بہ پہلو مشترکہ قومیت، ہندو مسلم اتحاد اور ہندستان کی آزادی کے داعی اور ترجمان بن کر میدان میں اتر آئے۔

ہندستان کی سیاست کے اس انقلابی دور میں **مولانا کی پہلی** ملاقات مہاتما جی سے ۱۸ جنوری ۱۹۲۰ء کو دہلی میں ہوئی۔ جہاں مسئلہ ترکی و خلافت کے متعلق وائسرائے سے گفتگو کرنے کے لئے تمام ممتاز ہندو اور مسلمان لیڈر جمع ہوئے تھے۔ اس موقعہ پر مرحوم **تلک** بھی موجود تھے اور وہی دن تھا جب **مولانا** اور **مہاتما گاندھی** کے درمیان محبت اور خلوص کا ایک ایسا رشتہ قائم ہوا جو **مہاتما جی** کے آخری دم قائم رہا **مولانا** کی زندگی میں **مہاتما جی** سے اُن کی یہ پہلی ملاقات ایک ایسا نشان راہ ہے جس کو **مولانا** کا کوئی سوانح نگار نظر انداز نہیں کرسکتا دو غیر معمولی فطرتوں کا یہ سنگم اپنی ایک عجیب خصوصیت رکھتا تھا جس پر ہمیں غور کرنا چاہیئے۔ **مولانا** کی زندگی بڑی حد تک مذہبی اور اُن کے افکار بھی لازماً مذہبی تھے۔ اسی طرح **مہاتما جی** بھی اپنے مذہب کے ایک پُرخلوص ترجمان اور اُس مذہب کی روحانیت کے بہت

بڑے داعی تھے۔ جس طرح **مولانا** نے اسی طرح **مہاتما جی** نے سیاست کو مذہبی روحانیت کی کسوٹی پر رکھ دیا تھا۔ دونوں اپنی اپنی جگہ ایک خاص مذہبی حیثیت رکھتے تھے۔ لیکن دونوں کی نظر میں مذہب اپنے وسیع تر معنی میں کوئی اختلافی مسئلہ نہ تھا۔ اسی لئے دونوں میں سے کسی کا مذہب اُس رسم و راہ، اخلاص و محبت میں حائل نہ ہو سکا جو ۲۸ سال تک ایک لمحہ کے تغیر اور رکاوٹ کے بغیر جاری رہی۔ یہ واقعہ بجائے خود اس حقیقت کا ترجمان ہے کہ شخصی مذہب ہندستان کی مشترکہ تہذیب اور مشترکہ قومیت کے تصورات میں رخنہ انداز نہیں ہو سکتا۔ البتہ **مولاناؒ** اور **مہاتما** کی فطرت میں ایک نمایاں اختلاف ضرور تھا لیکن وہ بھی ایسا تھا کہ ایک کی کمی دوسرے کی کمی کو پورا کرتی تھی۔ ایک Intellectual کی حیثیت سے **مولانا** کبھی عوامی آدمی نہ تھے اور نہ ہو سکتے ہیں۔ اُن کی انفرادیت ہجوم کو گوارا نہیں کرتی، لیکن **مہاتما جی** کی شخصیت یکسر عوامی شخصیت تھی، وہ عوام کی نظروں سے ہر چیز کو دیکھتے تھے اور عوام کے کانوں سے ہر بات کو سنتے تھے اور اُنہوں نے اپنی زندگی کو عوام کی زندگی میں اُس طرح حل کر دیا تھا کہ اُن کی نبض عوام کی نبض کے ساتھ حرکت کرتی تھی۔ اس طرح **مولانا** اور **گاندھی جی** گویا دو ایسی انتہاؤں پر تھے جو ایک دوسرے سے بہت دُور تھیں اور پھر بھی ایک دوسرے سے بالکل دور نہ تھیں۔ فطرت نے اس اختلاف ہی کے اندر ان دونوں کے

درمیان اتحاد اور ہم آہنگی کی بنیاد قائم کی۔

یہ پہلی ملاقات ہندستان کی تاریخ میں اس لئے بھی بہت بڑی اہمیت رکھتی تھی کہ لیڈروں کے اس اجتماع میں پہلی دفعہ **مہاتما گاندھی** کے اصولوں کو قبول کیا گیا۔ البتہ وائسرائے سے ملاقات کرنے کی تجویز سے **مولانا** نے اختلاف کیا۔ وہ گفت وشنید اور عرض و معروض کے قدیم طریقوں سے بہت بیزار تھے! اور اس لئے اس مجلس میں بھی اُنہوں نے اپنے اس خیال پر زور دیا کہ کسی وفد کا وائسرائے کے پاس جانا فضول ہے۔ البتہ وہ پہلے مسلمان لیڈر تھے جنہوں نے اس تاریخی اجتماع میں مہا**تما جی** کے پروگرام کی پوری پوری تائید کی۔ اُس وقت دوسرے مسلمان لیڈر جو **مولانا** کے ہم خیال تھے صرف **حکیم اجمل خاں** تھے۔

میرٹھ اور کلکتہ کی کانفرنسوں میں **مہاتما جی** کا پروگرام مکمل کیا گیا اور ناگپور میں بالآخر کانگریس نے اس پروگرام کی منظوری دی۔ اس کے بعد ہندستان کی سرزمین پر قومی جدوجہد کے جوش پرور نظارے دیکھے گئے وہ ہماری قومی تاریخ کے لازوال نقوش ہیں۔ اسی تحریک کے دوران میں **مولانا** کے لئے گرفتاریوں اور سزاؤں کا جو سلسلہ شروع ہوا وہ قلعہ احمد نگر کا دروازہ کھلنے اور آزادی کی پہلی منزل طے ہونے تک جاری رہا۔

سنہ ۱۹۲۰ اور سنہ ۱۹۲۱ کا دور تحریک خلافت کا دور تھا جو سنہ ۱۹

میں جلیانوالہ باغ کے قتل عام اور امرتسر کے اجلاس کانگریس کے بعد شروع ہوا۔ مولانا کی زندگی کا یہ اس قدر معروف زمانہ تھا کہ اس سیلاب میں اُن کے لئے صبح اور شام کا امتیاز باقی نہ رہا تھا۔ شمال سے جنوب تک سینکڑوں جلسوں اور کانفرنسوں میں اُنہیں تقریریں کرنی پڑتی تھیں اور اُن کے اوقات کا ایک لمحہ نہ تھا جو اس تحریک سے بے تعلق ہو۔ ہر موقعہ پر اور ہر جلسہ میں زندگی اور استقامت کا ایک ہی پیام تھا جو وہ ملک کے ہندوؤں اور مسلمانوں کو دے رہے تھے۔ ان خطبات اور تقریروں کے اگر کم سے کم اقتباسات بھی نقل کئے جائیں تو وہ بجائے خود ایک ضخیم کتاب بن جائے۔

اکتوبر ۱۹۲۰ء میں صوبائی خلافت کانفرنس آگرہ کو مخاطب کرتے ہوئے مولانا نے اس تحریک کی ۱۸ ماہ کی روئداد پر ایک نظر ڈالی اور مسلمانوں کو گاندھی جی کے اصول ترک موالات اختیار کرنے کی دعوت دی۔ اُنہوں نے فرمایا کہ:۔

"تحریک خلافت کی بدولت ہندستان کی آزادی کا سویا ہوا مسئلہ اس قوت سے جاگ اٹھا کہ آج اُسکا غلغلہ دنیا میں بلند ہے"

لیکن اب اس جدوجہد کی تیسری اور فیصلہ کن منزل آگئی تھی اور وہ یہ تھی کہ ترک موالات کے اصول کو اختیار کرکے وطن کی آزادی کا مطالبہ شروع کیا جائے۔ اُنہوں نے فرمایا کہ:۔

"یہ چیز جو ہمارے سامنے آرہی ہے پہلے ہی تیرہ سو سال سے موجود ہے .... اصل میدان ہندستان کا میدان ہے اصل فتح و شکست کا فیصلہ ہندستان کے اندر ہونے والا ہے۔ اگر آپ اپنے ملک کے اتفاق کے میدان، ترک موالات کے میدان بلکہ مختصر یہ کہ ایمان کے میدان میں کامیابی حاصل کرلیں تو دنیا کی کونسی طاقت ہے جو آپ کو شکست دے سکے۔ اگر آسمان کی تمام بجلیاں اتر آئیں، ہمالہ کی چٹانیں اپنی صفیں کھڑی کرلیں تو وہ ایک منٹ کے لئے ایمان کو شکست نہیں دے سکتیں۔ سب سے بڑی ضرورت اس بات کی ہے کہ آپ اپنے دلوں کے میدان کو فتح کرلیں، ایمان کے میدان کو، استقامت کے میدان کو، قربانیوں کے میدان کو اور ملک کے اتفاق کے میدان کو .... تحریک خلافت ہندستان کی آزادی کی تحریک ہے......"

مولانا نے اس زمانہ کے تمام خطبات میں بار بار وقت کی اسی حقیقت پر زور دیا کہ خلافت کی تحریک درحقیقت ہندستان کی آزادی کی تحریک ہے۔ دوسری بات جس پر **مولانا** نے اُن علماء کو جو تحریک خلافت میں حصہ لے رہے تھے متواتر توجہ دلائی ایک نظام شرعی کے قیام کی تجویز تھی۔ **مولانا** اُس وقت کے حالات کے لحاظ سے ضروری سمجھتے

تھے کہ ایک ایسی امارت شرعیہ قائم کی جائے جو مسلمانوں کی اخلاقی اور مذہبی زندگی کو حقیقی مذہب کے سانچے میں ڈھالے۔ فروری ۲۱ء میں صوبائی خلافت کمیٹی بنگال کے جلسہ کو مخاطب کرتے ہوئے **مولانا** نے فرمایا تھا کہ

"شریعت نے مسلمانوں کے لئے جہاں انفرادی زندگی کے اعمال مقرر کر دئے ہیں وہاں اُن کے لئے ایک اجتماعی نظام بھی مقرر کر دیا ہے۔ وہ کہتی ہے کہ زندگی اجتماع کا نام ہے، افراد و اشخاص کوئی شے نہیں۔ جب کوئی قوم اس نظام کو ترک کر دیتی ہے تو گو اُس کے افراد فرداً فرداً کتنے ہی شخصی اعمال و طاعات میں سرگرم ہوں لیکن یہ سرگرمیاں اس بارے میں کچھ سود مند نہیں ہو سکتیں اور قوم جماعتی مصیبت میں مبتلا ہو جاتی ہے .... شخصی اعمال کی اصلاح و درستگی بھی نظام اجتماعی پر موقوف ہے .... تمہاری سب سے بڑی گمراہی یہ ہے کہ خاص خاص وقتوں میں خاص خاص کاموں کا نام سُن پاتے ہو اور پھر چیخنے چلانے لگتے ہو اور جس طرح اونگھتا ہوا آدمی ایک دفعہ چیخ اُٹھتا ہے یکایک اعتقاد و عمل دونوں تمہیں یاد آجاتے ہیں حالانکہ نہ تو خاص خاص وقتوں ہی میں تمہاری مصیبت وجود میں آتی ہے اور نہ کامیابی کی راہ کسی خاص کام کے کرنے پر موقوف ہے

تمہاری مصیبت دائمی، تمہارا ماتم ہمیشگی کا، تمہارا روگ تمہاری ہڈیوں کے اندر سمایا ہوا اور تمہاری نحوست ۲۴ گھنٹے تمہاری ساتھی ہے اور ٹھیک اسی طرح تمہاری کامیابی و خوشحالی بھی ہر وقت تمہارے ساتھ سائے کی طرح دوڑ رہی ہے اور ہر آن و ہر لمحہ تمہارے وجود کے اندر سمائی ہوئی ہے۔ تم وقت پر سامنے آنے والی چیزوں کے غم میں کیوں گھلے جاتے ہو! اپنا ہمیشہ کا معاملہ ایک مرتبہ کیوں درست نہیں کر لیتے۔ جب تک دل و جگر کا علاج نہ ہوگا روز نئے نئے روگ لگتے رہیں گے ......"

اپنے بعض خطبات میں **مولانا** نے تفصیل کے ساتھ اپنی یہ تجویز پیش کی تھی۔ لیکن اُس زمانہ میں بھی علماء کی جماعت شخصی اور جماعتی اختلافات اور ذاتی تعصبات سے پاک نہ تھی۔ اس لئے یہ تجویز عملی صورت اختیار نہ کر سکی۔ اور بڑا معاملہ تو یہ سامنے آگیا کہ **امیر شریعت** اگر کسی کو بنایا جائے تو وہ کون ہو! بہرحال باوجود اُس شخصی اثر کے جو **مولانا** کو جماعت علماء میں حاصل ہو چکا تھا اُن کی یہ اسکیم سرسبز نہ ہو سکی۔

۱۹۲۱ء میں **علی برادران** اور اُن کے ساتھ بعض دوسرے لیڈروں پر کراچی میں مقدمہ چلایا گیا۔ ان ملزموں پر الزام یہ تھا کہ اُنہوں نے سرکاری فوج اور پولس کو جادہ وفاداری سے منحرف کرنے کی کوشش کی۔ ملزموں کو یہ الزام تسلیم تھا۔ جو لیڈر گرفتار نہیں ہوئے تھے اُنہوں نے بھی اعلانیہ

اس جرم کا ارتکاب شروع کیا۔ چنانچہ تمام لیڈروں نے اعلانات اور بیانات شائع کر کے پولس اور فوج کو مخاطب کیا۔ بمبئی کے ایک اجتماع میں لیڈروں نے اس مسئلہ کے متعلق جو مشہور اعلان شائع کیا وہ حکومت کو ایک کھلا چیلنج تھا۔ اس پر پہلے دستخط مہاتما گاندھی کے تھے اور دوسرے **مولانا** کے۔ لیڈروں کے اس متحدہ اقدام نے گرفتاریوں کا سلسلہ روک دیا، لیکن حکومت کے دست دراز کا یہ تعطل محض عارضی تھا۔ جس وقت برطانوی ولی عہد کی آمد کے سلسلہ میں بائیکاٹ کی تحریک شروع ہوئی اور تمام ملک میں شمال سے جنوب تک اور مشرق سے مغرب تک ہر گوشہ احتجاج اور بیزاری کے نعروں سے گونجنے لگا تو پھر ایک دفعہ حکومت نے لیڈروں کو سمیٹنا شروع کیا۔ چنانچہ بنگال میں **مولانا** اور **سی۔ آر۔ داس** گرفتار کر لئے گئے۔ اس مقدمہ میں **مولانا** نے عدالت کے روبرو جو بیان تحریری پیش کیا وہ اُن کے سیاسی افکار کی ایک ایسی دستاویز ہے جس کے آئینہ میں اُن کا سوانح نگار **مولانا** کی ذہنی اور سیاسی زندگی کا صحیح عکس دیکھ سکتا ہے۔ اس دستاویز کو **مولانا** کے ادبی شاہکاروں میں بھی ایک مخصوص مقام حاصل ہے اس موقعہ پر **مولانا** کے اس بیان کے بعض اقتباسات صرف اُن کے سیاسی افکار کی توضیح کرنے کے لئے نقل کئے جاتے ہیں لیکن اس سے پہلے اُن حالات کے پس منظر کا ایک گوشہ پیش کر دینا مناسب ہوگا جن حالات میں **مولانا** نے حکومت کو اپنے اوپر یہ وار کرنے کی

دعوت دی تھی۔

مارچ ۱۹۲۱ء میں مولانا نے مہاتما گاندھی کے ساتھ پنجاب کا تیسرا دورہ کیا۔ اُس وقت اضلاع لاہور اور امرتسر میں پبلک جلسوں اور تقریروں ممانعت تھی۔ باوجودیکہ مہاتما جی نے اِن امتناعی احکام کی خلاف ورزی نہیں کی اس لئے کہ خلاف ورزی کا پروگرام معطل کیا جا چکا تھا۔ لیکن مولانا نے اپنے متعلق یہ استدلال کیا کہ شخصی طور پر خلاف ورزی کرنے کا حق انہیں حاصل ہے اور افضلیت اسی میں ہے کہ وہ ایسا کریں۔ مہاتما جی نے بھی مولانا کے اس طرزِ عمل کو جائز قرار دیا۔ چنانچہ جمعہ کے دن شاہی مسجد میں خطبہ کے بعد مولانا نے ایک دل ہلا دینے والی تقریر کی۔ اس تقریر کے متعلق اُس زمانہ میں لاہور کے نیم سرکاری اخبار سول اینڈ ملٹری گزٹ نے لکھا کہ اس تقریر میں مولانا نے اہل پنجاب کو علانیہ خلاف ورزی قانون کی دعوت دی ہے اور اگر حکومت نے کوئی کارروائی نہ کی تو پنجاب کے شورش پسندوں کی ہمتیں بہت بڑھ جائیں گی۔ اس اداریہ کا عنوان "صحن مسجد میں باغیانہ لکچر" تھا۔ ایک ہی ہفتہ کے بعد مولانا نے ایک ایسی ہی تقریر امرتسر میں کی۔ پھر جب علی برادران گرفتار کر لئے گئے تو اُس گرفتاری کے دو دن بعد کلکتہ کے ایک بہت بڑے جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے مولانا نے فرمایا کہ:

" جس رزولیوشن کی بناء پر **علی برادران** گرفتار کئے گئے ہیں وہ اسلام کا ایک مانا ہوا اور مشہور و معروف مسئلہ ہے اور ہر مسلمان کا فرض ہے کہ اس کا اعلان کرے۔ وہ ریزولیوشن دراصل میرا ہی تیار کیا ہوا ہے اور میری ہی صدارت میں سب سے پہلے وہ اسی کلکتہ کے ٹاؤن ہال میں منظور ہوا تھا۔ میں اس سے بھی زیادہ تفصیل اور صفائی کے ساتھ اِس وقت اُس کے مضمون کا اعلان کرتا ہوں۔ یہ سی آئی ڈی کے رپورٹر بیٹھے ہیں اور میں اُن سے کہتا ہوں کہ حرف بحرف قلمبند کرلیں۔ اگر یہ جرم ہے تو گورنمنٹ کو یاد رکھنا چاہیئے کہ اس کا ارتکاب ہمیشہ جاری رہیگا "

پھر **دہلی** میں **جمعیتہ علماء** اور **خلافت کمیٹی** کے جلسوں میں بھی **مولانا** نے اس اعلان کو دُہرایا۔ اور ہر موقعہ پر بار بار دہراتے رہے لیکن بمبئی میں برطانوی ولی عہد کی آمد کے موقعہ پر جو فساد ہوا اُس سے متاثر ہوکر **مہاتما گاندھی** نے چند روز کے لئے اپنی تحریک کو بند کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس فیصلہ نے اہل ملک کے حوصلوں کو پست کردیا پھر بھی چند روز بعد ایک دوسری سمت سے خود حکومت کی سخت گیری نے قومی تحریک کے لئے نئے نئے دروازے کھول دیئے۔ **کلکتہ** میں جس وقت رضاکاروں کی جماعتوں اور مجالس کو خلاف قانون قرار دیا گیا تو اس حکم کی خلاف ورزی کے لئے فوراً ہی نئی نئی جماعتیں پیدا ہونے لگیں۔ حکومت نے

بھی روزانہ سینکڑوں اور ہزاروں رضا کاروں سے اپنے جیل خانے بھرنے شروع کر دیئے۔ ان حالات میں پھر ایک دفعہ مولانا کے لئے سرکاری مہمان خانہ کا دروازہ کھلا۔ جب مولانا کو اپنی گرفتاری کا یقین ہو گیا تو انہوں نے اپنا ایک مختصر بیان عام اشاعت کے لئے لکھ کر رکھدیا۔ جو اُنکی گرفتاری کے بعد شائع ہوا۔ اس بیان اُنہوں نے لکھا تھا کہ :-

"گورنمنٹ نے میری گرفتاری کا فیصلہ کر کے مجھے ایک بہت بڑے بوجھ سے نجات دیدی۔ خدا بہتر جانتا ہے کہ میرے لئے اب جیل سے باہر رہنا کس قدر تکلیف دہ ہو گیا تھا۔ جو چلے جاتے ہیں انہیں کیا معلوم کہ پیچھے رہ جانے والوں کے دلوں پر کیا گذرتی ہے؟ **محمد علی، شوکت علی لالہ لاجپت رائے، پنڈت موتی لال نہرو** سب کا سفر پورا ہو گیا اور میں اب تک منزل کے انتظار میں تھا۔ اب منزل میرے سامنے ہے اور میرا دل خوشی سے معمور ہے کہ ایک آخری مگر فتحمند میدان اپنے پیچھے چھوڑ رہا ہوں۔..... میں نے کلکتہ کے موجودہ میدان عمل کو "آخری اور فتحمند میدان" کہا۔ یہ میرا یقین ہے اور عنقریب تمام ملک دیکھ لیگا کہ جو کام دو سال کے اندر تمام ملک میں انجام نہ پا سکا وہ اِن چند دنوں کے اندر کلکتہ میں انجام دیا جائے گا۔

اگر میں گرفتار ہو گیا تو مہاتما گاندھی جی کو میرا یہ پیام پہنچا دیا جائے۔ "میں آپ کو آپ کی فتحیابی پر سب سے پہلے مبارکباد دیتا ہوں۔ اس مبارکبادی کے لئے آپ مجھے جلد باز نہ سمجھیں۔ میں اس اٹل وقت کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ رہا ہوں اور چاہتا ہوں کہ اُس کی مبارکباد دینے میں کوئی دوسرا مجھ پر سبقت نہ لیجائے ......"

عوام کو مولانا نے اپنے اس پیام میں چار سچائیوں کی طرف دعوت دی تھی۔

"ہماری فتحمندی کی تمام بنیاد چار سچائیوں پر ہے اور میں اس وقت بھی ملک کے ہر باشندے کو اُن ہی کی طرف دعوت دیتا ہوں:۔

(۱) ہندو مسلمانوں کا کامل اتفاق

(۲) امن

(۳) نظم

(۴) قربانی اور اُس کی استقامت

.... میں مسلمانوں سے خاص طور پر دو باتیں کہوں گا۔ ایک یہ کہ اپنے ہندو بھائیوں کے ساتھ پوری طرح متفق رہیں۔ اگر ان میں سے کسی ایک بھائی یا کسی ایک جماعت سے کوئی بات نادانی کی بھی ہو جائے

تو اُسے بخشدیں اور اپنی جانب سے کوئی بات ایسی نہ
کریں جس سے اس مبارک اتحاد کو صدمہ پہونچے۔ دوسری
بات یہ ہے کہ مہاتما گاندھی پر پوری طرح اعتماد رکھیں۔
اور جبتک وہ کوئی ایسی بات نہ چاہیں (اور وہ کبھی نہ
چاہیں گے) جو اسلام کے خلاف ہو اُس وقت تک
پوری سچائی اور مضبوطی کے ساتھ اُن کے مشوروں پر
کاربند رہیں۔"

چار سال نظربند رہنے کے بعد دسمبر ۱۹۱۹ئہ میں مولانا رہا ہوئے تھے۔
اور دو سال بعد پھر جیل میں داخل ہوگئے۔ عدالت میں مولانا نے
اپنا جو بیان تحریری داخل کیا اُس کے متعلق مہاتما گاندھی نے
ینگ انڈیا Young India میں لکھا تھا کہ:-

"مولانا کے بیان میں بہت بڑا ادبی حسن ہے، وہ نہایت
وسیع اور روانی کے ساتھ پرجوش ہے۔ اُس کا لہجہ
غیر متزلزل اور غیر استثنی طلب (ان کمپرومائیزنگ) ہے
مگر ساتھ ہی سنجیدہ اور متین بھی ہے......... ایسا معلوم
ہوتا ہے کہ گویا مولانا خلافت اور نیشنلزم پر ایک
پُراثر خطبہ دے رہے ہیں......... مولانا کے
بیان کا روئے سخن اگرچہ عدالت کی طرف ہے لیکن دراصل
وہ ملک و ملت سے خطاب کر رہے ہیں۔"

اس تاریخی بیان کے چند اقتباسات جو نقل کئے جاتے ہیں **مولانا** کے اُن احساسات کی پوری تصویر تو پیش نہیں کرتے جو بحیثیت مجموعی پورے بیان ہی کو پڑھ کر قلب و دماغ میں مرتب ہوسکتی ہے تاہم اس موقعہ پر **مولانا** کے افکار کے چند گوشے اِن اقتباسات میں بھی واضح ہوتے ہیں۔

اپنے بیان میں عدالتوں کی قدیم تاریخ کا حوالہ دیتے ہوئے **مولانا** نے فرمایا کہ:۔

"میں تسلیم کرتا ہوں کہ اب دنیا میں دوسری صدی عیسوی کی خوفناک تعزیری عدالتیں اور قرون وسطیٰ (مڈل ایجز) کی پُراسرار "انکویزیشن" وجود نہیں رکھتی لیکن میں یہ ماننے کے لئے تیار نہیں کہ جو جذبات ان عدالتوں میں کام کرتے تھے اُن سے ہمارے زمانہ کو نجات مل گئی۔ وہ عمارتیں ضرور گرا دی گئیں جن کے اندر وہ خوفناک اسرار بند تھے لیکن اُن دلوں کو کون بدل سکتا ہے جو انسانی خود غرضی اور ناانصافی کے خوفناک رازوں کا دفینہ ہیں............ اس جگہ (عدالت میں) کی عظیم الشان اور عمیق تاریخ پر جب میں غور کرتا ہوں اور دیکھتا ہوں کہ اسی جگہ کھڑے ہونے کی عزت آج میرے حصہ میں آئی ہے تو بے اختیار میری روح خدا کے حمد و شکر میں ڈوب جاتی ہے اور صرف وہی جان سکتا ہے کہ میرے دل کے سرور و نشاط کا کیا عالم ہوتا ہے۔ میں

مجرموں کے اس کٹہرے میں محسوس کرتا ہوں کہ بادشاہوں کے لئے قابل رشک ہوں۔ اُن کو اپنی خوابگاہ عیش میں وہ خوشی اور راحت کہاں نصیب جس سے میرے دل کا ایک ایک ریشہ معمور ہو رہا ہے۔ کاش غافل اور نفس پرست انسان اس کی ایک جھلک بھی دیکھ پائے۔ اگر ایسا ہوتا تو میں سچ کہتا ہوں کہ لوگ اس جگہ کے لئے دعائیں مانگتے۔"

جو الزام اس مقدمہ کی بنیاد قرار دیا گیا تھا اُس کی نسبت فرماتے ہیں

"ہندستان کی موجودہ بیوروکریسی ایک ویسا ہی حاکمانہ اقتدار ہے جیسا کہ اقتدار ملک و قوم کی کمزوری کی وجہ سے ہمیشہ طاقتور انسان حاصل کرتے رہے ہیں...... یہ واقعہ ہے کہ دنیا میں نیکی کی طرح برائی بھی زندہ رہنا چاہتی ہے۔ وہ خود کتنی ہی قابل ملامت ہو لیکن زندگی کی خواہش تو قابل ملامت نہیں۔

ہندستان میں بھی مقابلہ شروع ہو گیا ہے۔ اسلئے یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے اگر بیوروکریسی کے نزدیک آزادی اور حق طلبی کی جدوجہد جرم ہوا اور وہ اُن لوگوں کو سخت سزاؤں کا مستحق قرار دے جو انصاف کے نام سے اُس کی غیر منصفانہ ہستی کے خلاف جنگ کر رہے ہیں تو میں اقرار کرتا ہوں کہ میں نہ صرف اس کا مجرم ہوں بلکہ اُن

لوگوں میں ہوں جنہوں نے اس جرم کی اپنی قوم کے دلوں میں تخم ریزی کی ہے اور اس کی آبیاری کے لئے اپنی پوری زندگی وقف کردی ہے۔ میں مسلمانانِ ہند میں پہلا شخص ہوں جس نے ۱۲ھ میں اپنی قوم کو اس جرم کی عام دعوت دی! ور تین سال کے اندر اس غلامانہ روش سے اُن کا رخ پھیر دیا جس میں گورنمنٹ کے پُرپیچ فریب نے اُنہیں مبتلا کر رکھا تھا ....

میں اقرار کرتا ہوں کہ میں نے نہ صرف ان ہی دو موقعوں پر بلکہ گذشتہ دو سال کے اندر اپنی بے شمار تقریروں میں یہ اور اسی مطلب کے لئے اس سے زیادہ واضح اور قطعی جملے کہے ہیں۔ ایسا کہنا میرے اعتقاد میں میرا فرض ہے۔ میں اس فرض کی تعمیل سے اس لئے باز نہیں رہ سکتا کہ وہ دفعہ ۱۲۴ (الف) کا جرم قرار دیا جائے گا۔ میں اب بھی ایسا ہی کہنا چاہتا ہوں اور جب تک بول سکتا ہوں ایسا ہی کہتا رہوں گا۔ اگر میں ایسا نہ کہوں تو اپنے آپ کو خدا اور اُس کے بندوں کے سامنے بدترین گناہ کا مرتکب سمجھوں .... اگر میری ان دو تقریروں کے مطالب دفعہ ۱۲۴ (الف) کا جرم ہیں تو میں نہیں سمجھتا کہ صرف پہلی اور پندرہویں جولائی

ہی کا ارتکاب کیوں منتخب کیا گیا ہے۔ میں تو اس کثرت کے ساتھ اس کا ارتکاب کر چکا ہوں کہ فی الواقعہ اس کا شمار میرے لئے ناممکن ہو گیا ہے۔ مجھے کہنا پڑے گا کہ میں نے گزشتہ سالوں کے اندر بجز ۱۴۴ (الف) کی خلاف ورزی کے اور کوئی کام ہی نہیں کیا۔"

قانون اور فرض اور سچائی کے فلسفہ پر **مولانا** نے اپنے نقطۂ نظر کو اس طرح پیش کیا:۔

"مسلمان کا یہی وظیفہ ہے (ڈیوٹی) ہے کہ جس سچائی کا اُسے علم ویقین دیا گیا ہے ہمیشہ اُس کا اعلان کرتا رہے اور ادائے فرض کی راہ میں کسی آزمائش اور مصیبت سے نہ ڈرے۔ علی الخصوص جب ایسا ہو کہ ظلم وجور کا دور دورہ ہو جائے اور جبر وتشدد کے ذریعہ سے اعلان حق کو روکا جائے تو پھر یہ فرض اور زیادہ لازمی اور ناگزیر ہو جاتا ہے کیونکہ اگر طاقت کے ڈر سے لوگوں کا چپ ہونا گوارہ کر لیا جائے اور دو اور دو کو اس لئے چار نہ کہا جائے کہ ایسا کہنے سے انسانی جسم مصیبت میں مبتلا ہو جاتا ہے تو پھر سچائی اور حقیقت ہمیشہ کے لئے خطرہ میں پڑ جائے اور حق کے اُبھرنے اور قائم رہنے کی کوئی راہ نہ رہے۔ حقیقت کا قانون نہ تو طاقت کی تصدیق:

کا محتاج ہے۔ نہ اس لئے بدلا جا سکتا ہے کہ ہمارے
جسم پر کیا گذرتی ہے۔ وہ تو حقیقت ہے اور اُس وقت بھی
حقیقت ہے جب اُس کے اعلان سے ہمیں پھولوں کی سیج
ملے اور اُس وقت بھی حقیقت ہے جب اُس کے اظہار
سے ہمارا جسم آگ کے شعلوں کے اندر جھونک دیا جائے
صرف اس لئے کہ ہمیں قید کر دیا جائے گا۔ آگ میں ٹھنڈک
اور برف میں گرمی نہیں پیدا ہو سکتی۔"

اس بیان کے آخری جزو میں **مولانا** کے افکار اُن بلندیوں سے نیچے کی طرف دیکھ رہے ہیں جہاں سے حکومت کا تمام ساز و سامان قانون اور عدالت بہت چھوٹا اور ادنیٰ نظر آیا کرتا ہے۔ فرماتے ہیں کہ:۔

"مجھ پر سڈیشن کا الزام عائد کیا گیا ہے۔ لیکن مجھے بغاوت کے معنیٰ سمجھ لینے دو۔ کیا بغاوت آزادی کی اُس جد و جہد کو کہتے ہیں جو ابھی کامیاب نہیں ہوئی ہے؟ اگر ایسا ہے تو میں اقرار کرتا ہوں لیکن ساتھ ہی یاد دلاتا ہوں کہ اسی کا نام قابل احترام حب الوطنی بھی ہے، جب وہ کامیاب ہو جائے۔ کل تک آئرلینڈ کے مسلح لیڈر باغی تھے، لیکن آج ڈی ویلرا اور پارنل کیلئے برطانیہ عظمیٰ کے لئے کونسا لقب تجویز کرتی ہے!

پارنل نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ " ہمارا کام ہمیشہ ابتدا میں بغاوت اور آخر میں حب الوطنی کی مقدس جنگ تسلیم کیا گیا ہے۔"

میں مسلمان ہوں اور میرے یقین کے لئے وہ بس کرتا ہے جو میری کتاب وشریعت نے بتایا ہے۔ جسطرح مادہ اور اجسام میں انتخاب طبیعی Natural Selection اور بقاء اصلح Survival of the Fittest کا قانون جاری ہے اور فطرت صرف اُسی وجود کو باقی رہنے دیتی ہے جو صحیح اور اصلح ہو۔ ٹھیک اسی طرح تمام عقائد و اعمال میں بھی یہی قانون کام کر رہا ہے، آخری فتح اُسی عمل کی ہوتی ہے جو حق اور سچ ہوا اور اس لئے باقی اور قائم رہنے کا حقدار ہو۔ پس جب کبھی انصاف اور ناانصافی میں مقابلہ ہوگا تو آخر کی جیت انصاف ہی کے حصہ میں آئے گی۔......

بس آج جو کچھ ہو رہا ہے اُس کا فیصلہ کل ہوگا۔ انصاف باقی رہے گا اور ناانصافی مٹا دی جائے گی۔ ہم مستقبل کے فیصلہ پر ایمان رکھتے ہیں۔ البتہ یہ قدرتی بات ہے کہ بدلیوں کو دیکھکر بارش کا انتظار کیا جائے۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ موسم نے تبدیلی کی تمام نشانیاں قبول کرلی ہیں۔ افسوس اُن آنکھوں پر جو نشانیوں سے انکار کریں۔ میں نے اپنی تقریر کو

میں جو میرے خلاف داخل کی گئی ہیں کہا تھا کہ آزادی کا بیج
کبھی بارآور نہیں ہو سکتا جب تک جبر و تشدد کے پانی سے
اُس کی آبیاری نہ ہو۔
لیکن گورنمنٹ نے آبیاری شروع کر دی ہے ......
مسٹر مجسٹریٹ! اب میں اور زیادہ وقت کورٹ کا نہ لوں گا
یہ تاریخ کا ایک دلچسپ اور عبرت انگیز باب ہے جسکی ترتیب
میں ہم دونوں یکساں طور پر مشغول ہیں۔ ہمارے حصہ میں یہ
مجرموں کا کٹہرا آیا ہے تمہارے حصہ میں وہ مجسٹریٹ کی
کرسی۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ اس کام کے لئے وہ کرسی بھی اتنی
ہی ضروری چیز ہے جس قدر یہ کٹہرا۔ آؤ اس یادگار اور افسانہ
بننے والے کام کو جلد ختم کر دیں۔ مورخ ہمارے انتظار میں ہے
اور مستقبل کب سے ہماری راہ تک رہا ہے۔ ہمیں جلد جلد یہاں
آنے دو اور تم بھی جلد جلد فیصلہ لکھتے رہو۔ ابھی کچھ دنوں تک
یہ کام جاری رہیگا۔ یہاں تک کہ ایک دوسری عدالت کا
دروازہ کھل جائے۔ یہ خدا کے قانون کی عدالت ہے، وقت
اُس کا جج ہے، وہ فیصلہ لکھے گا اور اُسی کا فیصلہ آخری
فیصلہ ہوگا۔"

آج جبکہ وہ بدلیاں جن کی طرف **مولانا** نے اشارہ کیا تھا برس گئی
ہیں اور موسم کے بدلنے کی جو نشانیاں **مولانا** دیکھ رہے تھے وہ

ٹھوس اور غیر متزلزل حقیقتوں میں منتقل ہو چکی ہیں خدا کے قانون کی عدالت نے اپنا آخری فیصلہ دیدیا ہے اور حاکم و محکوم نے اپنی جگہوں کا تبادلہ کرلیا ہے **مولانا** کا وہ عدالتی بیان غیب کی ایک آواز معلوم ہوتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ جبر و استبداد اور محکومیت کے اُس گذرے ہوئے دور میں وہ کس قدر دُور رس اور کسقدر صحیح دیکھ رہے تھے۔

(۹)

مولانا کی سیاسی زندگی کا یہ باب بلاشبہ ہندستان کی تاریخ کا ایک شاندار اور روشن باب ہے۔ لیکن **مولانا** کے شخصی اعتقادات کی یہ روشنی اور بھی زیادہ روشن اُس تاریک زمانہ میں ہوتی ہے جب (سنہ ۲۱ کے بعد پھر انگریزی حکومت نے تفرقہ پردازی کا حربہ استعمال کیا اور فرقہ داری فتنہ و فساد کی تاریکی میں بڑے بڑے لیڈروں کے تصورات منتشر ہوگئے) اور بڑے بڑے محبانِ وطن کا لنگر ٹوٹ گیا۔ **مولانا** کی شخصی اور معنوی عزم و استقامت کا امتحان حکومت کے جبر و استبداد کی کسوٹی پر کوئی اتنا بڑا امتحان نہ تھا جتنی کہ وہ آزمائش تھی جس میں **مولانا** اس وقت مبتلا ہوئے جب ہندو مسلم اتحاد کا دور گذر چکا، وہ تعمیر ایک دفعہ پھر مسمار ہوگئی اور ایک دفعہ پھر حکومت نے فرقہ داری

تعصبات کی آگ روشن کردی۔ اُس آگ میں **مہاتما جی، مولانا، حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری، موتی لال نہرو** اور ایسے بہت اسے عوامی لیڈر جھونک دیئے گئے۔ **مولانا** کے عزم کی بلندی کے امتحان کا یہی وقت تھا۔ بہت سے بلند آہنگ لیڈر تھے جو اس امتحان میں پورے نہ اتر سکے۔ لیکن **مولانا** خود اپنی قوم کے ہاتھوں (جب وہ گمراہ ہو چکی تھی) سب کچھ جھیل گئے۔ برطانوی حکومت کا فولادی پنجہ اُن کے وجود معنوی کو اس قدر مجروح کبھی نہ کر سکا جتنے زخم کہ خود اُن کی گمراہ قوم نے ان کے دل و دماغ پر لگائے۔ مگر اُنھوں نے ان تمام جراحتوں کو شکوہ و شکایت کا ایک حرف بھی زبان پر لائے بغیر گوارا کر لیا۔ یہی **مولانا** کی اصلی بڑائی ہے جس پر اُنکی زندگی کا سوانح نگار بہت کچھ لکھ سکیگا۔ **مولانا** کی اس استقامت میں بہت کچھ دخل اُن کی نفسیاتی کیفیت کو بھی تھا۔ اپنی نفسیاتی خلوت میں اُنھوں نے اپنے سے کم درجہ کی مخلوق سے شکوہ و شکایت کرنے کی ادنیٰ سطح پر جانا اپنے ذہنی مقام کی توہین سمجھا۔ باوجودیکہ ایک غیر حکومت کی دار و گیر سے بہت زیادہ تیز اُن تیر اور نیزوں کی نوک تھی جو خود **مولانا** کی قوم نے اُن پر پھینکے اور انگریز کے ڈنک سے بہت زیادہ زہریلا وہ ڈنک تھا جو گمراہ مسلمانوں نے **مولانا** کے قلب و دماغ پر مارا لیکن ایک بڑے آدمی کی طرح اُنھوں نے ان حملوں کو قابل اعتنا نہ سمجھا۔ اُس احساس خودی اور علم و فضل کی اُس انانیت نے جو مولانا کے

...ی بنیاد ہے اُن کو ہمیشہ راہ و رسم عام سے علیحدہ رکھا اور یہی وجہ ہے کہ اُن کی ایک پُر تمکین (اور غیور) خاموشی تن تنہا اُن یورشوں کا مقابلہ کرسکی جو سالہا سال ہر قدم پر اُن کا راستہ روکتی تھیں۔

۱۹۲۱ء میں جب ہندو مسلم اتحاد کا دور گذر چکا اور آزمائش اور امتحان کا وہ دور شروع ہوا جو بالآخر ۱۹۴۷ء میں ختم ہوا۔ جب **مولانا** اور **گاندھی جی** کے رگ و پے میں ایک ناقابل بیان نیش غم اُتر گیا تھا اور تقریباً ۲۵ سال تک ان دونوں اور ان کے ساتھ چند دوسرے لیڈروں کو مسلمانوں اور ہندوؤں کے عقل و فہم کی بربادیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ ہر روز زلزلے آتے تھے اور متحدہ قومیت کی ٹوٹی ہوئی عمارت کی دیواروں کو مسمار کر جاتے تھے۔ تاہم امیدوں اور تمناؤں اور مضبوط ارادوں کی ایک ٹوٹی ہوئی محراب کے نیچے ملک کے یہ بلاکش سپاہی بیٹھے رہے! ور آزادی کی ایک نئی عمارت کے نقشے بناتے رہے۔

۱۹۲۰ء و ۱۹۲۱ء میں ہر موقعہ پر جب **مولانا** نے اپنے ہموطنوں اور خصوصاً مسلمانوں کو مخاطب کیا وہ بار بار تبلاتے رہے کہ اس ملک کی آزادی اور زندگی کی بنیاد ہندو مسلم اتحاد کے سوا کچھ نہیں۔

آگرہ میں صوبائی مجلس خلافت کے اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے **مولانا** نے فرمایا کہ:۔

ہندوستان کے لئے، ہندوستان کی آزادی کے لئے، صداقت وحق پرستی کے بہترین اور اعلیٰ فرائض ادا کرنے کے لئے ہندستان کے ہندو مسلمانوں کا اتحاد اور اُن کی یک جہتی ضروری ہے ....

ہندو مسلمانوں کے اتحاد کا مسئلہ اگرچہ اپنے سیاسی مسئلہ ہونے کی حیثیت سے ہندوستان کی نجات کے لئے ایک ضروری مسئلہ رہا ہے لیکن آج یہ مسئلہ محض تحریک خلافت کی بدولت ہی ہمارے سامنے نہیں آیا ہے بلکہ ہندستان میں ایسے لوگ پہلے بھی موجود تھے جو تحریک خلافت کی بنا پر نہیں بلکہ اس لئے اپنی ہدایت کا صحیح راستہ اختیار کر لیا تھا کہ اسلام کے اصولوں نے اور اسلامی تعلیم نے انہیں مجبور کیا تھا کہ ہندستان میں اپنے اس عقیدہ کا اعلان کر دیں ۔ تحریک خلافت سے تقریباً دس سال پہلے میں نے اس حقیقت کو محسوس کیا کہ اگر ہندستان کے مسلمان اپنے بہترین شرعی اور اسلامی فرائض انجام دینا چاہتے ہیں تو انہیں یہ کام بحیثیت ہندستانی ہونے کے انجام دینا چاہیئے ....

میں اپنے سینہ میں وہ دل رکھتا ہوں جس کے لئے ہدایت کی کوئی شعاعیں نہیں ہو سکتیں جو فاطر السموات نے نہ

سپاہی ہوں۔ میرا عقیدہ ہے کہ ہندستان میں ہندستان
کے مسلمان اپنے بہترین فرائض انجام نہیں دے سکتے
جب تک وہ احکام اسلامیہ کے ماتحت ہندستان کے
ہندوؤں سے سچائی کے ساتھ اتحاد و اتفاق نہ کرلیں۔۔
۔۔۔۔۔۔۔ ہندستان کے سات کروڑ مسلمان
ہندستان کے ۲۲ کروڑ ہندوؤں کے ساتھ مل کر ایسے
ہوجائیں کہ دونوں مل کر ہندستان کی ایک قوم اور
نیشن بن جائیں۔ آپ میں سے میں اب مسلمان
بھائیوں کو سنانا چاہتا ہوں کہ خدا کی آواز کے بعد سب
سے بڑی آواز جو ہوسکتی ہے وہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم)
کی زبان تھی۔ اس وجود مقدس نے ایک عہد نامہ
لکھا، بجنسہ یہ الفاظ اُس کے ہیں " انہ اُمّۃٌ واحدۃٌ ہم اُن
قبیلوں (غیر مسلم) سے جو مدینہ کے اطراف میں بستے
ہیں صلح کرتے ہیں، اتفاق کرتے ہیں اور ہم سب مل کر
ایک نیشن بنا چاہتے ہیں ایک قوم بنا چاہتے ہیں" ۔۔۔۔۔
۔۔۔۔۔ اگر میں نے اپنے اپیل میں کہدیا کہ ہندستان کے
مسلمان اپنا بہترین فرض اُس وقت انجام دیں گے
جب ہندوؤں کے ساتھ ایک ہوجائیں گے تو یہ وہ لفظ
ہے جو اللہ کے رسول نے اُسوقت لکھوایا تھا جب ہم سب ملکر

قریش کے مقابل ایک نیشن بن جانا چاہتے تھے ......

ہندومسلم اتحاد کے متعلق مولانا کے قلبی احساسات اس قدر گہرے ہیں کہ وہ اُن کی زندگی کا ایک مستحکم عقیدہ بن گیا ہے۔ ۱۹۲۳ء میں کانگریس کے اجلاس خصوصی کو مخاطب کرتے ہوئے اُنہوں نے آخری حد تک اپنے اس عقیدہ کے استحکام کا جن بلیغ الفاظ میں اظہار فرمایا تھا وہ ایسے تھے کہ ہمیشہ ہمیشہ مولانا کی سوانح حیات میں روشن رہیں گے۔ اُنہوں نے فرمایا تھا کہ:۔

"آج اگر ایک فرشتہ آسمان کی بدلیوں میں سے اُتر آئے اور دہلی کے قطب مینار پر کھڑا ہو کر یہ اعلان کردے کہ سواراج ۲۴ گھنٹے کے اندر مل سکتا ہے، بشرطیکہ ہندستان ہندو مسلم اتحاد سے دست بردار ہو جائے تو میں سواراج سے دستبردار ہو جاؤں گا مگر اُس سے دستبردار نہ ہوں گا۔ کیونکہ اگر سواراج ملنے میں تاخیر ہوئی تو یہ ہندستان کا نقصان ہو گا لیکن اگر ہمارا اتحاد جاتا رہا تو یہ عالم انسانیت کا نقصان ہے۔"

اس سے بڑی کوئی بات ہندو مسلم اتحاد کے عقیدے کے متعلق کہنی ممکن نہ تھی۔ لیکن ہماری بدقسمتی سے بالکل اُسی صورت میں ہندستان کو آزادی ملی ہے جس کا مولانا کو اندیشہ تھا۔ سواراج ملا ہے لیکن ہندو مسلم اتحاد کا خون بہا کر۔ تاہم مولانا اُن حوصلہ مند انسانوں میں سے

ایک ہیں جو ہندستان کی فرقہ واری تقسیم کے اس المیہ کے باوجود اپنے مقام پر قائم ہیں اور یقین رکھتے ہیں کہ پھر ایک دفعہ مہاتما گاندھی کے خون سے اس سرزمین پر وحدت قومی کا ایک ہمہ گیر تصور کارفرما ہوگا۔

اس مسئلہ پر مولانا گزشتہ ۴۸ سال میں جو کچھ فرما چکے ہیں ان کے اس فرمودہ کا ہر لفظ اپنی جگہ قائم ہے۔ باوجودیکہ اس زمانہ کے ایک "قائداعظم" جو خود ہندو نسل سے پیدا ہوئے اور جن کے تمام آبا و اجداد ہندو تھے ۔انگریزی تدبر کی مدد سے اپنے "دو قومی نظریہ" کو مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد پر محیط کر چکے ہیں اور اس طرح ہندستان میں جمعیت اسلامی کے دو ٹکڑے ہو گئے ہیں لیکن اس تقسیم کے فرقہ وارانہ اغراض میں بھی برطانوی سامراج کے بہت سے منصوبے روپوش بیٹھے ہوئے ہیں!

۲۲ء میں گاندھی جی پھر محبوس کر دئے گئے اور ملک میں عدم تشدد اور ہندو مسلم اتحاد کے تصورات کو فرقہ پرستی کے مفاسد نے بُری طرح مجروح کر دیا۔ حتیٰ کہ خود گاندھی جی نے اپنے ہم مذہبوں سے یہ طعنے سنے کہ تم نے خلافت کی تحریک میں مسلمانوں کا ساتھ دے کر ہندوؤں کے مفاد کا خون کیا ہے!

۱۹۲۳ء میں جب ایک دفعہ پھر اپنی زندگی کا کچھ زمانہ قید فرنگ میں گذارنے کے بعد مولانا باہر آئے تو اُنہوں نے دیکھا کہ خود کانگریس کے اندر بعض اصولی اختلافات پیدا ہو گئے ہیں۔ مہاتما جی نے قید میں جاتے وقت کانگریس کو ہدایت کی تھی کہ وہ اپنی رہی سہی طاقت تعمیری پروگرام کے لئے وقف کر دے۔ اُن کے جانے کے بعد مسٹر راجگوپال اچاری، سردار پٹیل راجندر بابو اور ڈاکٹر انصاری اس امر پر زور دے رہے تھے کہ مہاتما جی کا تعمیری پروگرام جاری رکھا جائے اور کانگریس اپنی تمام قوت کو اسی کام میں صرف کرے۔ لیکن پنڈت موتی لال نہرو کی قیادت میں ایک جماعت ایسی بھی تھی۔ جو ہندو مسلم اتحاد کی کوششوں میں ناکام رہ کر اب یہ چاہتی تھی کہ انگریز سے جنگ کرنے کا ایک محاذ دستوری مجالس کے اندر بھی قائم کیا جائے۔ عرف عام میں یہ جماعتیں "چینجر Changer اور "نو چینجر No Changer کہلائیں۔ اور ایک عرصہ تک اُن کے اختلافات نے صحافت اور عوامی جلسوں کے محاذ پر ایک ہنگامہ برپا رہا۔ اُس وقت جب مولانا نے جیل سے باہر آکر نظریات کے اختلاف کا یہ ہنگامہ برپا دیکھا تو اُنہوں نے محسوس کیا کہ ہندو مسلم اتحاد کی کوشش تو رہی ایک طرف اب تو خود کانگریس کے اندرونی اختلافات کو مٹانے کی کوئی تدبیر ضروری ہے۔ مولانا کے سامنے ایک مشکل یہ بھی تھی کہ ایسا کیا

جماعت دستوری مجالس میں شرکت کے خلاف ایک امتناعی فتوے دے چکی تھی اوراب اُس فتویٰ کے ہوتے ہوئے "جینجرس" کے پروگرام کی تائید کرنا بہت مشکل تھا۔ دسمبر ۲۳ء میں مولانا کے زیرصدارت اسی مسئلہ کے طے کرنے کے لئے کانگریس کا ایک خاص اجلاس دہلی میں منعقد ہوا۔ جب مولانا پہلی دفعہ کانگریس کی صدارت کے لئے منتخب ہوئے تواُن کی عمر ۴۰ سال سے بھی کم تھی اوراس طرح یہ خیال غلط نہیں کہ اُن سے پہلے یا بعد کانگریس کے کسی صدر نے اتنی کم عمر میں یہ قومی اعزاز حاصل نہیں کیا۔ پنڈت جواہرلال نہرو نے اپنی سوانح عمری میں لکھا ہے کہ " اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ میں کانگریس کا سب سے کم عمر صدر ہوں۔ میری عمر ۴۰ کے قریب تھی جب میں پہلی دفعہ کانگریس کا صدر منتخب ہوا۔ گوکھلے کی بھی تقریباً یہی عمر تھی۔ مگر مولانا ابوالکلام آزاد جو مجھ سے عمر میں کسی قدر بڑے ہیں غالباً ۴۰ سے کم تھے جب وہ صدر منتخب ہوئے
اگر تصور کیجئے اُن حالات کا اور زندگی کے اس مدوجزر کا جس سے گذشتہ ۲۵ سال میں مولانا گذرے توایک حدتک اُن کے دل و دماغ کی اُن وارداتوں کا اندازہ ہوسکتا ہے جن سے اُن کی معنوی زندگی معمور رہی ہے۔ اسی کیفیت کو پنڈت جواہرلال نہرو نے "تلاش حق" کی چند سطروں میں کس قدر خوب بیان کیا ہے:۔

" میرا ورثہ کیا ہے؟ وہ سب کچھ جو بنی نوع انسان نے

حاصل کیا، وہ سب دُکھ جو اُس نے سہے ہیں، وہ سب
خوشیاں جن سے اُس نے لطف اُٹھایا ہے اسکی
فتح کے نعرے اور شکست کی تلخیاں۔ انسان کی
وہ عظیم الشان مہم جو اب سے مدتوں پہلے شروع
ہوئی تھی اور اب تک جاری ہے۔ یہ وہ میراث ہے
جو مجھ میں اور دنیا کے انسانوں میں مشترک ہے۔"

مولانا کی عمر کے چالیس سال بھی انسانیت کی اُسی مشترک میراث کا ایک گرانقدر حصہ ہیں۔ زندگی کی اس شاہراہ پر بڑے بڑے انسانوں کی زندگی جو نشان راہ قائم کرتی ہے اُن ہی میں ایک نشان راہ مولانا کی وہ زندگی اور بصیرت ہے جس کی راہ میں اُن کا وطن موت وزیست کی کشمکش اور فتح کے نعروں اور شکست کی تلخیوں کا مزا چکھتا رہا۔

دہلی کے اس اجلاس خاص کے خطبۂ صدارت میں مولانا نے کانگریس کے انتشار کو ایک آزمائشی دور سے تعبیر کیا اور از سرنو مہاتما گاندھی کے عدم تشدد اور عدم تعاون کے پروگرام کی توضیح فرمائی اور اپنے اس یقین کا اظہار کیا کہ موجودہ پسپائی کے بعد پھر ایک دفعہ جدوجہد کے میدان میں کانگریس آگے بڑھے گی! اُنہوں نے فرمایا کہ یہ تعطل صرف ایک وقفہ ہے

یعنی آگے بڑھیں گے دم لیکر!

آج ہم گذشتہ ۴۵ سال کی تاریخ میں یہ حقیقت صاف دیکھ رہے ہیں کہ مولانا کا اندازہ کتنا صحیح تھا۔ دستوری مجالس میں شرکت وعدم شرکت کے متعلق مولانا نے اپنے خطبۂ صدارت میں جس دانائی کے ساتھ سارے مسئلہ کا تجزیہ کیا اس کا اندازہ اُنکے الفاظ ہی سے ہو سکتا ہے۔ اُنہوں نے فرمایا کہ:۔

"یہ ظاہر ہے کہ جب کوئی اختلاف رائے پیدا ہو تو ہمارا پہلا فرض یہ ہے کہ ہم دیکھیں کہ یہ اصول کا اختلاف ہے یا فروع کا۔ اس کا اثر کسی جڑ پر پڑتا ہے یا محض شاخ پر؟ اگر وہ اختلاف اصول کا اختلاف ہے تو بلاشبہ ہمارا فرض ہے کہ ہم زیادہ سے زیادہ ثبات و استقامت اُس میں ظاہر کریں۔ نرمی اور درگذری کی اُس میں کوئی گنجائش نہیں ہو سکتی۔ کثرت و قلت رائے کا سوال اس کے لئے خارج از بحث ہے۔ ڈسپلن کا سوال بھی اُس پر موثر نہیں ہو سکتا لیکن اگر وہ محض ایک شاخ کا اختلاف ہے تو پھر صورت حال بالکل بدل جاتی ہے۔ یہاں بھی ہمیں اپنے رائے میں کمزور ہونے کی وجہ نہیں۔ لیکن عمل میں اتنا سخت نہ ہونا چاہیئے کہ کسی طرح کی لچک قبول نہ کریں۔ ضرورت ہوگی تو ہم اُس سے

قطع نظر بھی کرلیں گے۔ کوئی بڑی مصلحت سامنے
آجائے گی تو اُس چھوٹی چیز کو اُس پر قربان بھی
کردیں گے۔ جماعت کا ساتھ ، ورا تباع اور نظام
کا ڈسپلن سب اُس سے اوپر رہیں گے ،
اُس کے لئے چھوڑ نہیں دیئے جائیں گے۔ عزم
اور ثبات یقیناً انسان کے لئے اول درجہ کے
اوصاف ہیں مگر اُسی حال میں جبکہ اپنے صحیح محل
پر صرف کئے جائیں۔ اور صحیح تعداد میں خرچ کئے
جائیں۔ میں بلا کسی تامل کے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اس
مسئلہ کا اختلاف نان کو اپریشن کے لئے قطعاً
کوئی اختلاف نہ تھا۔ نان کو اپریشن بحیثیت ایک
اصول کے کیا ہے ؟ میں یقین کرتا ہوں کہ کوئی شخص
اس کے جواب میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ پروگرام
کی دفعات ہیں ...... وہ ان سب سے بالاتر
کوئی چیز ہے اور وہی نان کو اپریشن ہے۔ ہمیں
معلوم ہے کہ اختلاف نان کو اپریشن میں نہ تھا ،
اس بارے میں نہ تھا کہ ہمیں کونسلوں میں اشتراکِ عمل
کے لئے جانا چاہیئے یا نہیں۔ صرف یہ تھا کہ ہمیں
اصلاحی کونسلوں کے دوسرے انتخاب کے موقع پر

بھی وہی طرزِ عمل اختیار کرنا چاہیئے جو پچھلی دفعہ اختیار کیا تھا یا اُس میں تبدیلی کرنی چاہیئے .... یہ تو صرف پروگرام کی ایک دفعہ کا اختلاف تھا .... نان کواپریشن کی اصل صرف یہ ہے کہ ہم موجودہ دفتری اقتدار سے اشتراکِ عمل نہیں کر سکتے ۔ پس جب ایک شخص نے اُس سے اتفاق کیا تو وہ نان کواپریٹر نہیں ہے اب رہی یہ بات کہ کسطرح یہ بات لطور ایک قومی حرکت کے عمل میں لائی جائے تو اس کے لئے جو کچھ بھی ہم طے کریں گے وہ ضرور واجب العمل ہے لیکن بہرحال اصل نہیں فرع ہے [illegible] ہے اور اگر اس میں اختلاف رائے ہو تو وہ [illegible] اہمیت کا مستحق نہیں ہو سکتا جو اصولی اختلاف کو دی جا سکتی ہے .... افسوس ہے کہ اس اختلاف نے ایسی اہمیت فریقین میں حاصل کرلی کہ گویا یہ کوئی اصولی اختلاف ہے اور دونوں طرف سے اس پر اسقدر قوت خرچ کی گئی کہ گویا قومی جدوجہد کا جینا مرنا اسی پر موقوف ہے ...... بہرحال جو اہمیت اس معاملہ کو دی گئی اُس سے مجھے اختلاف ہے .... میں وثوق کے ساتھ یہ رائے رکھتا ہوں کہ گیا کانگرس میں خواہ

آپ نے یہ فیصلہ کیا ہوتا کہ کونسلوں کا بائیکاٹ کرنا چاہیئے
خواہ یہ کیا ہوتا کہ اُن پر قبضہ کرنا چاہیئے۔ جو کچھ بھی کیا
ہوتا لیکن اگر آپ متفق رہتے تو آج اُن مشکلات کا
نام ونشان بھی نہ ہوتا جن کی وجہ سے جدوجہد کا ایک ایسا
قیمتی برس جیسا کہ ۲۳ء ہے بالکل ضائع گیا۔"

مولانا نے اس اختلاف کو فرقہ داری فتنہ کے سر اٹھانے کا یہی ایک بہت بڑا سبب قرار دیا اور اُس تمام افراط وتفریط پر افسوس کرتے ہوئے یہ مشورہ دیا کہ:۔

"ایک طرف ہماری ایک جماعت کونسلوں میں چلی جائے
دوسری طرف کونسلوں کے باہر بھی سرگرمیاں جاری
رہیں۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی دونوں جگہ کی نگرانی
کرے اور ایک نظام کے ماتحت دونوں جگہ کام ہو"

مولانا کے تدبر کی شہرت کا اساس اُن کی یہی ذہنی استعداد ہے کہ وہ مسائل کا تجزیہ بہت صحیح فرماتے ہیں اور جذبات کو کبھی اجازت نہیں دیتے کہ وہ اُن کی قوت فیصلہ کا توازن خراب کرسکیں۔ اس موقعہ پر بھی مولانا نے اپنے حسن تدبر کی ایک حیرت انگیز مثال پیش کی اور علماء کے فتوے کے متعلق بھی خلاف اور موافق جماعتوں کے درمیان ایک ایسا توازن پیدا کردیا کہ دونوں جماعتوں کے عمل کا جواز اپنی اپنی جگہ تسلیم کرلیا گیا۔ لیکن اُس زمانہ میں جب اندرونی

اختلافات اور ہندو مسلم مناقشات کی وجہ سے کانگریس کی ساکھ بہت گر چکی تھی یہ بگڑی ہوئی بات کچھ زیادہ بن نہ سکی۔ گاندھی جی نے بھی ۱۹۲۴ء میں جیل سے باہر آنے کے بعد مولانا کے اس "درمیانی راستہ" کو اختیار کیا۔ دستوری مجالس میں موتی لال نہرو جیسے لیڈروں کی آواز گونجتی رہی اور دنیا کے ہر گوشہ میں سنی جاتی رہی اور اس طرح بین الاقوامی حلقوں میں کانگریس کے مقاصد کی نشر و اشاعت کا کام انجام پاتا رہا۔ لیکن فرقہ واری فتنہ بھی اپنی جگہ باقی رہا اور اس آگ کو ہوا دینے والے اپنے کام سے غافل نہ رہے۔

آخر کار ۱۹۲۴ء میں مہاتما جی نے ۲۱ دن کا برت رکھا۔ اور اُس کے زیر اثر ایک اتحاد کانفرنس دہلی میں منعقد ہوئی۔ جس میں تقریباً ۱۵۰ ہندو مسلمان لیڈر شریک ہوئے۔ اس موقعہ پر مولانا نے اتحاد اور سمجھوتہ کی فضا پیدا کرنے میں بہت بڑا حصہ لیا۔ مولانا کے شرکاءکار نے اس حقیقت کو تسلیم کیا کہ کانفرنس کے مباحث میں مولانا کی خطابت اور اخلاقی قوت نے بہت بڑا کام کیا ہے۔

اس گفتگو کے دوران میں جب سب سے زیادہ جھگڑا قربانی گاؤ کے مسئلہ پر ہو رہا تھا تو مولانا نے فریقین کو مخاطب کر کے صلح اور مفاہمت کا ایک ایسا بنیادی اصول پیش کیا جو آج بھی وہی وزن اور وہی قیمت رکھتا ہے جو آج سے ۴۲ سال پہلے

رکھتا تھا۔ مولانا نے فرمایا کہ:۔

"اس تمام قضیہ کا حل صرف اس بات میں ہے کہ ہر شخص اپنے حقوق پر زور دینے کے بجائے اپنے فرائض کی تکمیل کے لئے تیار رہے"

مولانا کی زندگی میں اُن کی راہ ہمیشہ یہی رہی، اسلئے کاشکہ جن لوگوں نے اُن کو نہیں سمجھا وہ بھی انسانیت اور اخلاق کی اس راہ کا پتہ پاتے تو ہندستان اس قدر مجبور اور مجروح نہ ہوتا جتنا کہ آج ہے۔

اپنا برت ختم کرتے وقت مہاتما جی نے حاضرین سے یہ عہد لیا کہ وہ ہندو مسلم اتحاد کے لئے اپنی جانیں قربان کردیں گے۔ اُس دن جن لیڈروں نے یہ عہد کیا تھا ان میں سے حکیم اجمل خاں ڈاکٹر انصاری، ریورینڈ اینڈریوز اور سی آر داس آج اس دنیا میں موجود نہیں ہیں لیکن سب سے پہلے خود مہاتما جی نے اپنے اس عہد کو پورا کردیا اور ہندستان کی آئندہ نسلوں کے لئے وہ اپنا ایک ایسا نقشِ قدم چھوڑ گئے جو قرنوں اور صدیوں تک سجدہ گاہ صاحب نظراں ہوگا۔ لیڈروں کی اُس جماعت میں سے جس نے اُس دن مہاتما گاندھی سے یہ عہد کیا تھا شاید اب تنہا مولانا ہی اس دنیا میں باقی ہیں جنہوں نے مہاتما کی طرح ہندو مسلم اتحاد کے عقیدے کو اپنے سیاسی ایمان اور

انسانی اخلاق کی ایک محکم بنیاد بنا لیا ہے۔ اس گذرے ہوئے قافلہ کی تنہا یادگار اب مولانا ہی کی ذات ہے جن کے دل کا ایک گوشہ شاید اب بھی اسی ایک امید سے آباد ہے کہ

شاید کہ بجوئے رفتہ باز آید آب!

شاید کہ وہ اپنی زندگی میں مہاتما جی کے خواب کی صحیح تعبیر دیکھ لیں۔ حالانکہ ہندستان کی بدبختانہ تقسیم نے اس وقت تو بظاہر تاریخ ہند کے اس باب پر تمام شد لکھ دیا ہے!

(۱۱)

سیاسی جمود اور فرقہ داری کشت وخون کا یہ زمانہ گذرتا چلا گیا۔ اب زندگی کے بے چین سمندر میں روشنی کے چند ہی مینارے باقی رہ گئے تھے۔ جو اس ظلماتی طوفان کی موجوں کا مقابلہ کر رہے تھے۔ صف اول کے کانگریسی لیڈروں میں سے بعض دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔ اور جو باقی تھے وہ پھر کسی موقعہ کے منتظر تھے تاآنکہ برطانوی تدبر نے خود ہی ایک ایسا قدم اٹھایا کہ کانگریس کو میدان میں آنے کا موقعہ مل گیا۔ سائمن کمیشن کے ہندستان آنے کا اعلان کیا گیا اور یہ معلوم ہوا کہ غلامی کی زنجیروں کو زیادہ مضبوط کرنے کے لئے ایک نیا دستور اس ملک پر عاید کیا جانے والا ہے۔ چنانچہ تمام ملک میں کمیشن کے بائیکاٹ کی تحریک شروع ہو گئی

اور اس نقطہ پر کانگریس کی تمام قوت از سر نو مرکوز ہونے لگی۔ اس محاذ پر کانگریس کے دونوں فریق پوری طرح متحد ہو گئے اور پھر ایک متحدہ محاذ قائم ہو گیا۔ اس تحریک کے مظاہروں میں **موتی لال نہرو** اور **جواہر لال نہرو** جیسے لیڈروں نے پولس کے ڈنڈے کھائے۔ **جواہر لال** نے تو اپنی سوانحعمری میں اس محاذ کے بہت ہی دلچسپ مناظر پیش کئے ہیں۔

برطانوی تدبر بلند تھا کہ دستوری اصلاحات کا ایک نیا کھلونا پیش کر کے ہندستان کی آنکھوں میں دھول ڈالے۔ سائمن کمیشن کے بائیکاٹ سے جو جنگ شروع ہوئی وہ ایک فیصلہ کن منزل پر اُس وقت پہونچی جب ۲۹ء میں ایک نئے دستور کے نفاذ کا اعلان کیا گیا۔ اُسوقت کانگریس نے "کامل آزادی" کے بنیادی نصب العین پر اپنا مورچہ قائم کر دیا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ فرقہ پرستی کا زہر تمام ملک میں سرایت کر چکا تھا اور اسی کے زیر اثر ایسے بڑے بڑے مسلمان لیڈر بھی۔ جیسے کہ **علی برادران** تھے کانگریس سے جدا ہو چکے تھے۔ گو کہ بظاہر **نہرو رپورٹ**، **علی برادران** اور بعض دوسرے مسلمان قائدین کی کانگریس سے جدائی کا باعث سمجھی گئی لیکن اس افتراق میں بعض شخصی عناصر کو بھی بہت دخل تھا۔ ان عناصر کو غیر ملکی حکومت نے نہایت چالاکی کے ساتھ تقویت پہنچائی تھی۔ بہر حال یہی وہ نقطہ تھا جہاں سے ایک طرف تو کانگریس نے کامل آزادی کی تنقیح پر ایک فیصلہ کن جنگ کرنے کا فیصلہ کیا اور دوسری طرف مسلم لیگ کے فتنہ کی بنیاد

بھی قائم ہونے لگی۔

اس سے پہلے ۲۷ء میں ایک آل پارٹیز کانفرنس کے ذریعہ سے ایک دفعہ پھر فرقہ داری اختلافات کو رفع کرنے کی کوشش کی گئی۔ اس کانفرنس کے صدر مسٹر محمد علی جناح تھے۔ نتائج کے اعتبار سے شملہ کی سرزمین بھی بنجر ثابت ہوئی اور ڈاکٹر مونجے اور ظفر علی خان دونوں اپنے اپنے ڈنڈے ہوا میں گھمانے کے بعد مخالف سمتوں میں واپس ہوگئے۔ اس ناکام کوشش کے بعد فرقہ واری منافرت کے شعلے اور بھی زیادہ بلند ہونے لگے اور ہر طرف ایک خونریز ہنگامہ برپا ہوگیا۔ اُس وقت کلکتہ میں بعض لوگوں نے یہ خواہش کی کہ مولانا ایک جلسہ عام میں تقریر کریں۔ لیکن عالم یہ تھا کہ کسی قوم پرست مسلمان کے لئے جلسہ عام میں ہندو مسلم اتحاد کا نام لینا خطرہ سے خالی نہ تھا۔ دونوں فریق اس جلسے میں اپنے اپنے غنڈے اور بدمعاش لیکر آئے اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مولانا پر حملہ کرنے اور جلسہ کو منتشر کرنے کی نہایت جنگجویانہ تیاریاں کی گئی ہیں۔ ایسے ہی مواقع پر مولانا کی بیخوف اور بے پروا" انفرادیت" نمایاں ہوا کرتی ہے۔ چنانچہ مولانا جلسہ میں تشریف لے گئے اور اس مجنون اور پاگل مجمع کے روبرو دو گھنٹے تک تقریر کرتے رہے۔ وہ تقریر مولانا کی خطابت کا ایک شاہکار اور معجزہ تھا۔ جلسے کے تماشائیوں نے دیکھا کہ جو غنڈے مولانا اور اُن کے شرکا پر حملہ کرنے گئے تھے وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہے

ہیں اور مولانا کے الفاظ تیر ونشتر کی طرح اُن پر برس رہے ہیں! مولانا کی زندگی میں اُن کی بے پناہ انفرادیت کے امتحان کا یہ ایک بہت بڑا اور یادگار موقعہ تھا۔ دوسرا موقعہ وہ تھا جب ۱۵ اگست ۴۷ء کے بعد دہلی کے خونریز ہنگامے میں مولانا دن اور رات خطرات کی پرواکئے بغیر اُس آگ کے شعلوں میں گھستے تھے اور مظلوموں کی حفاظت واعانت کا ممکنہ سر وسامان کرتے تھے۔

جدید اصلاحات کی اسکیم کے مقابلہ میں کانگریس نے ستیہ گرہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ ۳۰ء کی یہ ستیہ گرہ کانگرس کی جدوجہد کا ایک اور نمایاں نشان راہ ہے۔ اسی نشان راہ سے کامیابی کی طرف پہلا موڑ آیا۔ گوکہ گاندھی جی اور لارڈ اردن کے سمجھوتہ کے بعد بھی لندن کی گول میز کانفرنس کامیاب نہ ہوسکی اس لئے کہ اُس کانفرنس کی بساط پر انگریزوں نے اپنے فرقہ داری مہرے رکھدیئے تھے لیکن اس کانفرنس کا نتیجہ اتنا تو ہوا کہ دنیا کو ایک دفعہ پھر یہ حقیقت یاد آگئی کہ سیاسی گفت وشنید میں برطانیہ کی نیت نہ کبھی پہلے بخیر تھی اور نہ اب ہے۔ اُس نے گول میز کانفرنس میں ایک ہی قسم کے مسلمان لیڈروں کو جمع کرکے اور ڈاکٹر انصاری جیسے نیشنلسٹ مسلمان لیڈر کو بھی شریک کرنے سے انکار کرکے اپنی نیت کا نقص پوری طرح ظاہر کردیا تھا گاندھی جی بادل ناخواستہ کانفرنس میں شریک ہوئے اور خالی ہاتھ واپس آئے۔ ہندستان کے انگریزی

حلقوں اور اینگلو انڈین صحافت میں اُن کے خالی ہاتھ آنے پر اظہار مسرت کیا گیا اور علانیہ جداگانہ حقوق کے حامیوں کی حمایت کر کے اس حقیقت کے چہرہ سے نقاب اُٹھا دی گئی کہ انگریز فرقہ پرستوں کو آڑ بنا کر آزادی کے مطالبہ سے گریز کرنا چاہتا ہے۔ برطانوی تدبر کا یہ مسلک آخر تک قائم رہا اور بالآخر اُسی کے بطن سے **پاکستان** پیدا ہوا۔

گول میز کانفرنس سے واپس آتے ہی گاندھی جی پھر گرفتار کر لئے گئے۔ ۲۶ جنوری ۱۹۳۰ء کو کانگریس نے تمام ملک میں "یوم آزادی" کے مظاہرے کئے اور ماہ مارچ میں **گاندھی جی** نے نمک کی ستیہ گرہ کا اعلان کیا۔ اس طرح حکومت کے تشدد کا بھی ایک نیا دور شروع ہوا اور ۵ مئی کو **گاندھی جی** کی گرفتاری کے بعد لیڈروں کی گرفتاریوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ لیکن سول نافرمانی کی اس تحریک نے تمام ملک میں آگ لگا دی۔ **مولانا** کی شخصی قیادت نے پھر ایک دفعہ اپنے نفوذ و اثر کا حیرت انگیز ثبوت دیا، حتیٰ کہ بنگال، پنجاب اور صوبہ سرحد میں جہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی اور فرقہ پرستی نے بھی بہت زور پکڑا تھا۔ لاکھوں مسلمانوں نے ستیہ گرہ میں حصہ لیا۔ کہا جاتا ہے کہ ۶۰ ہزار اشخاص گرفتار ہوئے اور سینکڑوں مارے گئے۔ **گاندھی جی** کی گرفتاری کے بعد **مولانا** بھی گرفتار ہو گئے۔

سنہ ۳۰ کی ستیہ گرہ کے شروع ہونے سے پہلے کانگریس کے
مسلمان قوم پرست لیڈروں اور کارکنوں نے ایک کوشش یہ بھی
کی تھی کہ مسلمان عوام سے قریب تر ربط پیدا کریں۔ **ڈاکٹر انصاری**
اُس وقت زندہ تھے۔ اُن کے اور **مولانا** کے مشورے سے سنہ ۲۹
میں کانگریس کے اندر مسلم قوم پرستوں کی ایک جماعت منظم کی گئی۔
مولانا اُس کے صدر تھے اور **تصدق احمد خاں شروانی** سکریٹری
اور **ڈاکٹر انصاری** ٹریزرر۔ جماعت کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کی تمام
حریت پرست اور ترقی پسند جماعتوں کو ایک ہی پلیٹ فارم پر جمع کیا جائے
اور رجعت پسند اور فرقہ پرست مسلم جماعتوں مقابلہ کیا جائے لیکن
اس پارٹی کی راہ میں ایک مشکل یہ حایل تھی کہ **علی برادران** اب
کانگریس کے میدان سے ہٹ رہے تھے۔ وہ سائمن کمیشن اور نفاذ
اصلاحات کے خلاف سول نافرمانی کے مخالف تھے اور اُن کی وجہ سے
بعض دوسرے مسلمان لیڈر بھی پیچھے ہٹ رہے تھے۔ اُس وقت بھی
مسلمان قوم پرستوں کے سب سے بڑے قائد **مولانا** ہی تھے
جو کانگریس کی تحریک کی پوری پوری تائید کر رہے تھے۔

ڈاکٹر انصاری کے انتقال کے بعد قوم پرست مسلمانوں کی
قوم پرستی کے سب سے بڑے قلعہ دار صرف **مولانا** ہی رہ گئے اور
آج تک ہیں۔ اُن ہی کی رہنمائی میں اس جماعت نے اپنا کام، جس
حد تک ممکن ہوا جاری رکھا۔ آج بھی جبکہ فرقہ پرستی کا معید ہندستان میں

مسمار ہو چکا ہے۔ (یا ہو جانا چاہیئے) اور وطن پرستی اور قوم پرستی کے کھلے میدان میں مسلمانوں کو (مسلم لیگ کی شدید آمریت سے نجات پاکر) سانس لینے کا موقعہ ملا ہے اُن کے لئے **مولانا** کی قیادت اور رہنمائی پہلے سے بھی زیادہ ضروری ہے۔ ہندستان کے قوم پرست مسلمانوں کی مشکلات میں اعلان آزادی کے بعد کمی ہونے کے بجائے کچھ اور اضافہ ہو گیا ہے۔ اس لئے کہ مسلم لیگ کی فرقہ پرستی نے ہندستان کے ہندوؤں کی فرقہ پرست جماعتوں کو بہت قوت بخشی ہے اور مشترکہ قومیت کے اِن دشمنوں کو اب یہ کہنے کا موقعہ مل گیا ہے کہ جب مسلمانوں نے ہندستان کو تقسیم کرا کے اپنا حصہ لے لیا تو اب وہ ہندستان میں اپنے لئے مساوی شہریت کا دعویٰ نہیں کر سکتے۔ اول تو انہیں اب اپنے "قومی وطن" میں چلا جانا چاہیئے اور اگر نہ جائیں تو ہندستان میں "ہندو حکومت" کا زیر دست ہو کر رہنا چاہیئے۔ اِس "ہندو" ذہنیت سے خود کانگریس کے بعض لیڈر بھی متاثر ہو چکے ہیں اور وہ قوم پرست مسلمانوں کو تحقیر کی نظر سے دیکھ رہے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہندستان کے نیشنلسٹ مسلمانوں کی سیاسی حیثیت کبھی بھی ملک میں اتنی کمزور اور رادنیٰ نہ تھی جتنی کہ ظاہر کی گئی۔ خود کانگریس کے بعض گوشوں میں اس جماعت پر یہ الزام رکھا گیا کہ وہ اپنی بے عملی کی وجہ سے ملک کی کوئی خدمت نہ کر سکی۔ حتیٰ کہ گذشتہ انتخابات میں بھی اُس سے کانگریس کو مدد نہ مل سکی۔ لیکن اگر فرقہ پرستی

کے اُن تعصبات سے جو کانگریس کے بعض گوشوں میں پیدا ہو گئے ہیں قطع نظر کر کے دیکھا جائے تو یہ حقیقت ناقابل انکار ہے کہ ۱۵ اگست سے پہلے بھی اور بعد کو بھی نیشنلسٹ مسلمانوں کی اقلیت نے اپنے وجود کو قائم رکھ کر کانگریس کے نیشنلزم کو استوار رکھا۔ اگر وہ اپنی جگہ قائم نہ رہتے تو "نیشنل کانگریس" کا "نیشنل" رہنا ناممکن ہو جاتا۔

مسٹر جناح نے جس وقت "جداگانہ اسلامی قومیت" کا فتنہ انگیز نعرہ بلند کیا تو سب سے پہلے نیشنلسٹ مسلمانوں نے ہی اپنی قوم کو اس جداگانہ قومیت کے خطرہ سے آگاہ کرنے کی کوشش کی۔ مولانا ہی کی قیادت میں ایک "آل انڈیا انڈی پینڈنٹ مسلم کانفرنس" دہلی میں منعقد ہوئی جس میں تقسیم کے اصول کی سختی سے مذمت کی گئی۔ باوجودیکہ اس کانفرنس کو رائے عامہ کی کافی تائید حاصل ہوئی لیکن بعض وجوہ سے اُس کے کارکن منظم طریقہ سے کام نہ کر سکے اگر اُس وقت یہ تحریک منظم ہو جاتی تو اُس کشمکش کی آخری منزلوں میں جو کانگریس اور لیگ کے درمیان ۱۹۴۷ء تک جاری رہی قوم پرست مسلمانوں کا وزن یقیناً اس قابل ہوتا کہ وہ محسوس کیا جاتا۔ لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ پھر بھی یہ جماعت مخالفوں کے مورچوں کے سامنے رہی۔ سب سے زیادہ اُسی کو مسلم لیگ کے حملوں کا ہدف بننا پڑا، سب سے زیادہ وہی فرقہ پرست مسلمانوں کی بدگوئی اور بدگمانی اور زبان درازی کا شکار رہی۔ (حقیقت تو یہ ہے کہ اگر خود کانگریس کے اندر نیشنلسٹ

مسلمانوں کو ناپسند کرنے والی جماعت رکاوٹیں پیدا نہ کرتی اور کانگریس ان مسلمانوں کی کچھ زیادہ امداد کر سکتی تو بلا شبہ گذشتہ انتخابات میں بھی اس جماعت کی جدوجہد کے بہتر نتائج پیدا ہوتے) ایک ایسے ملک میں جہاں ۹۰ فیصدی مسلمان نسلاً غیر مسلم اکثریت سے وابستہ ہیں اور معاشرت و تمدن بھی بڑی حد تک مشترکہ ہے مسٹر جناح کا دو قومی نظریہ صرف اس لئے کامیاب ہو سکا کہ ایک طرف تو انگریز کے چالاک تدبر سے کانگریسی لیڈروں نے دھوکہ کھایا اور دوسری طرف خود کانگریس کے بعض گوشوں میں مسلمان "...tuals" کے زیادہ با اثر ہونے کو ناپسند کیا گیا۔ اس کے علاوہ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ۱۹۳۷ء سے پہلے کی کانگریسی وزارتوں نے بعض صوبوں میں اپنے طرز عمل سے لیگ کو اس کا موقعہ دیا کہ وہ مسلم عوام کو کانگریس سے بددل کرنے کے لئے وزارتوں کی لغزشوں کو مبالغہ آمیز انداز میں بیان کریں اور مسلمانوں کو یقین دلائیں کہ وہ غیر مسلم اکثریت کے ساتھ رہ کر کبھی محفوظ نہ رہ سکیں گے۔ لیکن باوجود ان تمام مشکلات کے نیشنلسٹ مسلمانوں نے جب گذشتہ انتخابات میں کانگریس کا ساتھ دیا تو یہ ضرور ثابت کر دیا کہ اب بھی ملک کے ایک تہائی مسلمانوں میں اُن کا اثر باقی ہے۔ وہ الیکشن تو نہ جیت سکے لیکن یہ ضرور ثابت کر سکے کہ مسلم لیگ کا یہ دعویٰ کہ وہ مسلم عوام کی واحد نمایندہ ہے یقیناً غلط ہے۔ بابو راجندر پرشاد نے اپنی کتاب ' ' میں تسلیم کیا ہے کہ

قوم پرست مسلمانوں نے لیگ کے مقابلہ میں جو الیکشن لڑے اُن سے یہ حقیقت ظاہر ہوگئی کہ یہ جماعت سیاسی حیثیت سے اس قدر ناقابل اعتنا نہیں ہے جتنا کہ اس کو ظاہر کیا گیا تھا۔ کانگریس کے صدر تسلیم کرتے ہیں کہ گذشتہ عام انتخابات میں مسلمانوں کے جتنے ووٹ ڈالے گئے اُن میں سے قوم پرست مسلمانوں نے بعض صوبوں میں ایک تہائی اور بعض میں ½ حاصل کئے۔ اس صورت میں یہ تو ظاہر ہے کہ وہ لیگ کے مقابلہ میں کچھ زیادہ نشستیں حاصل کرنے کے قابل نہ تھے لیکن ملک میں اُن کی سیاسی حیثیت کا صحیح معیار بلاشبہ یہی ہے کہ ایک تہائی مسلمان ضرور اُن کے ہم خیال تھے۔ مسلمانوں کی اکثریت والے صوبوں میں جہاں لیگ مسلمانوں کی واحد نمایندگی کا دعوے کرتی تھی ۴۰ فی صد ووٹوں کا نیشنلسٹ مسلمانوں کے حق میں ہونا کوئی معمولی بات نہیں۔ بابو راجندر پرشاد نے اپنی کتاب میں بعض اسلامی اکثریت والے صوبوں کے حسب ذیل مصدقہ اعداد پیش کئے ہیں۔ جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ اِن صوبوں میں نشستوں کے اعتبار سے بھی الیکشن کے نتائج ایسے نہ تھے کہ قوم پرست مسلمانوں کی سیاسی حیثیت کو ناقابل اعتنا سمجھا جاتا۔

نام صوبہ	نشستوں کی تعداد جو لیگ نے حاصل کیں	نشستوں کی تعداد جو غیر لیگیوں نے حاصل کیں	لیگیوں کی فی صد کامیابی	غیر لیگیوں کی فیصد کامیابی
سرحد	۱۷	۲۱	۴۱	۵۸
سندھ	۲۶	۸	۵۶	۴۳
پنجاب	۷۳	۱۳	۶۵	۳۴
آسام	۳۱	۳	۶۹	۳۱

سرحد، پنجاب اور آسام میں تو لیگ اپنی وزارتیں بھی نہ بنا سکی۔ اب دیکھنا ہے کہ اگر اس حالت میں

جبکہ لیگ کی شدید ترین مخالفت کے باوجود قوم پرست مسلمان اس حد تک کامیاب ہو سکے تو اُس صورت میں اُن کی کامیابی کتنی زیادہ ہوتی جب کانگریس کا اقتدار ان مسلمانوں کی طرف سے بے پروا نہ ہوگیا ہوتا۔ اُس صورت میں کون کہہ سکتا ہے کہ آج دو قومی نظریہ اور تقسیم کے معاملہ میں یہ جماعت اپنا پورا وزن متحدہ ہندستان کے دشمنوں کو محسوس نہ کرا سکتی۔ بہرحال وہ وقت گذر گیا اور اب تقسیم کے بعد قوم پرست مسلمانوں کو از سرِ نو ہندستان کے بہکائے ہوئے اور گم کردہ راہ مسلمانوں کے لئے ایک صحیح راہ تجویز کرنی تھی۔ چنانچہ پھر **مولانا** ہی کی قیادت پر اس جماعت کی شیرازہ بندی اور رہنمائی کا بار عاید ہوا اور پھر ایک دفعہ **مولانا** نے ہندستان کے مسلمانوں کے مستقبل کی تشکیل پر توجہ فرمائی۔ چنانچہ دسمبر ۱۹۴۷ء میں اعلانِ آزادی کے بعد مولانا کی صدارت میں ہندستان کے مسلمانوں کا سب سے بڑا اجتماع **لکھنؤ** میں ہوا جہاں **مولانا** نے ہندستان کے ۴½ کروڑ مسلمانوں کو **انڈین یونین** میں عزت و آبرو کے ساتھ زندہ رہنے کی صحیح راہ بتائی۔ اپنی غیر سرکاری زندگی میں اب **مولانا** کی زندگی کا سب سے بڑا مشن یہی ہے کہ اُن ۴½ مسلمانوں کے لئے ہندستان کی مشترکہ اور جمہوری شہریت میں ایک مقام پیدا کریں جن کو مسلم لیگ کی غلط سیاست نے مہجور اور مجروح بنایا ہے۔

لکھنؤ کی مسلم کانفرنس کا مقصد صرف یہ تھا کہ اب

ہندستان میں فرقہ پرستی کو ہمیشہ کے لئے ختم کیا جائے اور مسلمانوں کو ملک کی مشترکہ سیاست میں اپنے ہم وطنوں کے دوش بدوش ملک کے وفادار شہریوں کی حیثیت سے آگے بڑھایا جائے۔ **مولانا** نے اپنے خطبۂ صدارت میں کانگریس کے نصب العین اور اپنے مقصد کو صاف صاف بیان فرمادیا تھا۔ انہوں نے فرمایا تھا کہ ملک کی موجودہ مشکلات کا کوئی نیا حل وہ پیش نہیں کر سکتے بلکہ :۔

"جو حل میں آپ کو بتلا سکتا ہوں وہ میرے لئے بہت پُرانا حل ہے جو ۳۶ اور ۴۰ برس پہلے میں آپ سب کے سامنے رکھ چکا ہوں۔ وہ میرے لئے کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ اس طرح کے اس ملک میں ہزاروں اور لاکھوں اشخاص موجود ہیں جو جو اس رائے میں میرے شریک تھے اور جو آج بھی شریک ہیں .... جو مشورہ میں دے سکتا ہوں" اُس کے پیش کرنے میں میں نے کمی نہیں کی ہے ...... میں کسی کے دل کو تو بدل نہیں سکتا اور کسی کے سر میں نیا دماغ نہیں رکھ سکتا۔ میں جو کچھ کر سکتا ہوں وہ یہ ہے کہ جس چیز کو میں صحیح سمجھتا ہوں اُس کو اُن کے سامنے رکھدوں ......

اُن بربادیوں میں جو ۱۵ اگست کے بعد ہوتی رہی ہیں

بدقسمتی سے ہر فرقہ پرست جماعت کے لوگ اضافہ
کرتے رہے اور کوئی جماعت ایسی نہیں جس کے
دامن پر خون کا دھبہ نہ لگا ہو ...... جہاں تک
فرقہ پرستی کا تعلق ہے یہ ایک دروازے سے نہیں
آئی بلکہ کئی دروازوں سے آئی ہے۔ تو اب یہ
سب دروازے بند ہونے چاہئیں۔ میں آپ سے
درخواست کرتا ہوں کہ اگر ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہندستان
جس کی آزادی کا ہم ۷۰ برس سے خواب دیکھ رہے
تھے برباد نہ ہو اور بربادی کے کسی نئے دروازے
میں نہ گھس جائے تو ہمارا فرض یہ ہو جاتا ہے کہ جس
دروازے سے یہ فرقہ پرستی آئی ہے اُسی دروازہ
کو بند کردیں اور اسے ختم کردیں۔"

مولانا نے ایک لاکھ مسلمانوں کے اس اجتماع کو خبردار کیا کہ:-

"جو کچھ مسلمانوں کو کرنا ہے اُس میں ایک دن کی بھی
دیر خطرناک ہے۔ یہ میرا یقین ہے اور اس حقیقت کو
میں دیکھ رہا ہوں اور آپ میں سے ہر شخص جو اپنی
آنکھ کے پپوٹوں کو کھلا رکھنا چاہتا ہے دیکھ سکتا
ہے کہ اس سے بڑھ کر خطرناک کوئی چیز نہیں ہے
اس لئے اب فرقہ پرستی کو ختم کرنا ہوگا اور وہ

فرقہ پرستی جس دروازے سے بھی آئی ہو اُس کو بند کرنا ہوگا۔ ایک دروازہ جو مسلمانوں کے ذریعہ سے کھولا گیا تھا مسلم لیگ کا تھا۔ وہ اب بند ہونا چاہیئے۔ اور اگر وہ اب بھی بند نہیں کیا جاتا ہے تو بہت بڑی ذمہ داری آپ پر رہ جائے گی"

لیگ کے متعلق مولانا نے فرمایا:۔

"پچھلے دس سال کے اندر فرقہ داری تحریک کی ایک خاص تاریخ بن چکی ہے۔ اُسکی ایک خاص روایت اور زندگی بن چکی ہے، اُس کا ایک روایتی اساس قائم ہوچکا ہے جس سے اُس کو الگ نہیں کر سکتے کوئی ہستی اُس کو اور اُس کی تاریخ کو بدل نہیں سکتی کہ کل تو الف تھے اور آج (ب) ہو گئے!........

ابھی تو وہی انجمن موجود ہے، وہی دیوار کھڑی ہے اُس کی وہی پچھلی تاریخ موجود ہے، اُس کا خمیر بھی ابھی تک وہی ہے، اُس کی تمام روایات بھی وہی ہیں جو اُسے چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہیں تب اس طرح کی لیپ پوت کرکے آپ ملک کی فضا پر کوئی اچھا اثر نہیں ڈال سکتے........

جہاں تک اس اجتماع کا تعلق ہے آپ صاف

اور دو ٹوک فیصلہ کریں کہ آئندہ کوئی مسلم مجلس
کوئی مسلم منظام، سیاسی میدان میں فرقہ داری
بنیاد پر قائم نہ کریں گے۔ کسی مجلس کے مقصد پر
فرقہ واریت کی پرچھائیں بھی نہ پڑنی چاہیئے ......"

اس کے بعد **مولانا** نے اپنے خطبہ صدارت میں اس امر پر زور دیا کہ ہندستان کے مسلمانوں کو اب کانگریس میں شریک ہو کر ملک کی ترقی میں حصہ لینا چاہیئے۔ لیکن انہوں نے فرمایا کہ:۔

"محض فیصلوں سے کام پورا نہیں ہوتا۔ اگر آپ نے
یہاں فیصلہ کر لیا اور رزولیوشن پاس کر لئے اور
گھر جا کر چپ بیٹھ گئے تو اُس سے کوئی نتیجہ نہیں نکل
سکتا اور نہ ملک کی وہ آب و ہوا جو خراب ہو گئی ہے
درست ہو سکتی ہے۔ یہ تو جب ہی ہو سکتا ہے
جب آپ کوئی نہ کوئی ایسی مشین عارضی طور پر
بنا لیں جو ان فیصلوں کو عملی جامہ پہنائے اور تمام
مسلمانوں کے اندر ایک نئی آب و ہوا پیدا
کر دے"

اسی مشورہ کے مطابق "کمیٹی اتحاد و ترقی" کی تشکیل عمل میں آئی ہے اور اس کا کام اب **مولانا** کی رہنمائی میں جاری ہے **مولانا** سے زیادہ کون جان سکتا ہے کہ ہندستان کے ۴ ½ کروڑ مسلمانوں

کی سیاسی حیثیت کو دو قومی نظریہ اور ملک کی تقسیم نے برباد کر ڈالا ہے اور اب اُن کو از سرِ نو ملک کی سیاسی زندگی میں ایک باعزت مقام پر لانے کے لئے ایک پہاڑ کی چڑھائی چڑھنی ہے۔ اگر یہ کام پورا ہو سکا (اور کوئی وجہ نہیں کہ اُس کی تکمیل نہ ہو سکے) تو **مولانا** کی سوانح حیات میں اُن کا یہ ایک بہت بڑا کارنامہ ہوگا۔ اور ہندوستانی مسلمانوں کی آیندہ نسلوں کا سر **مولانا** کے نام کے آگے ہمیشہ احسانمندی اور عقیدت کے ساتھ جھکا رہیگا۔

نیشنلسٹ مسلمانوں کی تحریک کا یہ تذکرہ سلسلہ بیان سے کچھ آگے بڑھ گیا اس لئے کہ مدنظر یہ تھا کہ اس تحریک کا مختصر ذکر ایک ہی جگہ آجائے۔ اب ہمیں پھر دس برس پیچھے ہٹ کر **مولانا** کی زندگی میں واقعات کے تسلسل کو قائم رکھنا ہے۔

(۱۳)

گاندھی جی کی قید کے زمانہ میں کانگریس نے اپنا تعمیری کام جاری رکھا لیکن مسلمان فرقہ پرستوں کا تخریبی کام بھی انگریزوں کی مشفقانہ اور مربیانہ سرپرستی کے تحت جاری رہا۔ مولانا محمد علی اور ڈاکٹر انصاری کے انتقال کے بعد مسٹر جناح کو بھی پھر اُس منظر عام پر

آنے کا موقعہ ملا جس سے وہ ایک دفعہ شکست کھا کر ہٹ چکے تھے اور اُن کی قیادت کا میدان وسیع ہونے لگا۔ اُسی زمانہ میں دنیا کی بین الاقوامی سیاست نے پھر ایک پلٹا کھایا اور ۳۹ء میں پھر یوربین دول کی ہوسناکیاں ایک دوسرے کے گریبان سے اُلجھ گئیں۔ ہٹلر نے جمہوریت کے نام سے سامراج کے فریب کی نقاب پارہ پارہ کردی اور جرمن آمریت اور فسطایت کو دنیا پر مسلط کرنیکا دعویٰ پیش کردیا۔ یہ وقت ہندستان کے وطن پرستوں کے لئے عجیب وقت تھا۔ جبکہ ایک طرف تو وہ جمہوریت کے فریب اور دھوکہ سے بھی واقف تھے اور دوسری طرف فسطائیت اور آمریت کے خطرہ کا بھی مقابلہ کرنا ضروری سمجھتے تھے۔ وہ نہ تو انگریزی سامراج کو گوارا کرسکتے تھے اور نہ ہٹلر کی آمریت سے اپنا کوئی رشتہ قائم کرنا پسند کرتے تھے۔ وہ ان دونوں سے الگ رہ کر اپنے وطن کی آزادی کے تخیل پر اپنے افکار کی بنیاد قائم کرچکے تھے اور حقیقت یہ ہے کہ نہ تو انگریز کی فتح اُنہیں خوش کرسکتی تھی اور نہ ہٹلر کی شکست، وہ چاہتے تھے کہ دونوں ہی کے ڈنک کا زہر نکل جائے!

اُس وقت کانگریس نے **مولانا** کی قیادت میں اتحادیوں سے یہ مطالبہ کیا کہ وہ اس جنگ میں اپنے مقاصد اور ارادوں کا صاف صاف اعلان کردیں۔

لیکن **مسلم لیگ** اب "تقسیم کرو اور حکومت کرو" کے شیشہ کی

شراب کا ایک جام لبریز پی چکی تھی اور اس لئے وہ جنگ کے فتنہ میں ملک کی آزادی کے خواب کی تعبیر تلاش کرنے کے بجائے انگریز کی مدد سے جداگانہ حقوق حاصل کرنے کی فکر میں تھی۔ "جداگانہ حقوق" کا زہریلا بیج لارڈ منٹو کے زمانہ میں بویا گیا تھا اُس سے اب فرقہ پرستی کا ایک گھنا جنگل پیدا ہو چکا تھا۔ تعصبات کے اس گھنے جنگل میں مسلم لیگی قیادت نے اپنی عقل کو گم کر دیا۔ وہ صرف اس بات پر "یوم نجات" مناتی رہی کہ کانگریسی وزارتیں صوبوں کی حکومت سے دست بردار ہو گئیں اور انگریز کا تدبر اس بنا پر خوشی کے نقارے بجانے لگا کہ پھر ایک دفعہ اُس کا قدیم مسلک کامیاب نکلا۔

اس زمانہ میں جب **مسلم لیگ** "یوم نجات" منا چکی تھی **مولانا** نے ایک بیان شائع کیا جس کے بعض اجزاء کا نقل کر دینا **مولانا** کے نقطہ نظر کی وضاحت کے لئے بالکل کافی ہے۔ **مولانا** نے اس بیان میں فرمایا تھا کہ:۔

> "مسلمانوں کو پورا حق حاصل ہے کہ وہ اپنے حقوق اور مفادات کے لئے جس قسم کی جد و جہد کرنا چاہیں کریں۔ یہ اُن کا اندرونی قضیہ ہے۔ لیکن اُنہیں کسی حالت میں کوئی ایسا کام نہ کرنا چاہیئے جو ہندستان کی آزادی کے خلاف دلیل لایا جا سکے۔ **مسٹر جناح** کا موجودہ طرزِ عمل مسلمانوں کو اسی بدبختانہ صورتِ حال

کی طرف لے جا رہا ہے۔ اس کے صاف یہ معنیٰ ہیں کہ
مسلمانوں کو ہندستان کی آزادی کی راہ میں سنگِ راہ
بنایا جا رہا ہے۔ میں نے ۱۲ء میں بھی مسلمانوں کو
اس خطرہ سے متنبہ کیا تھا۔ میرے دل کی گہرائیاں
اس خیال سے مجروح ہوتی ہیں کہ آج ۲۰ سال
کے بعد مجھے پھر وہی بات کہنی پڑی ہے۔"

اس نقطۂ نظر کے صلہ میں بارگاہِ قیادتِ عظمیٰ سے **مولانا** کو "شو بوائے" کا خطاب عطا ہوا!

پھر جب دوسری جنگ عظیم کی آگ نے تمام دنیا کے رختِ انسانیت کو اپنے شعلوں میں لپیٹ لیا اور جرمن فسطائیت کے مقابلہ میں نام نہاد جمہوریت کا پلّہ ہلکا نظر آنے لگا اور ہندستان اور ایشیا کے ممالک دونوں طرف سے ان شعلوں میں گھر گئے تو اس وقت تک اس عالمگیر ہیجان کے باوجود بین الاقوامی بساطِ سیاست پر **ہندستان** کا کوئی مقام نہ تھا **مسٹر چرچل** صاف کہہ رہے تھے کہ وہ اس لئے برطانیہ کے وزیر اعظم نہیں بنتے ہیں کہ **ہندستان** کو آزاد کر کے برطانوی سلطنت کو تحلیل کر دیں۔ جنگ کے اس نازک ترین دور میں کانگریس نے **مولانا** کو پھر ایک دفعہ اپنا صدر منتخب کر کے اُن کی ذات اور اُن کے فہم و تدبر میں اپنے غیر مشروط اعتماد کا اظہار کیا یہ واقعہ ایک تاریخی اہمیت رکھتا ہے کہ **مولانا** کی صدارت کے اس دور

نے ہندستان کو بین الاقوامی سیاست سے اتنا قریب کردیا جتنا کہ وہ کبھی پہلے نہ تھا اُس وقت تک کانگریس کے حلقوں میں — یا تو اس لئے کہ ہندی تہذیب ایک جزیرہ بن کر ایک ہزار سال تک باہر کی دُنیا سے بے تعلق رہی تھی یا اس لئے کہ انگریزوں کے زیر اقتدار یہ ملک اتنا دب گیا تھا کہ بین الاقوامی دنیا میں اُس کی کوئی حیثیت باقی نہ رہی تھی۔ کانگریسی لیڈروں کا نقطۂ نظر بین الاقوامی سیاست کے متعلق بہت محدود ہوگیا تھا، حتیٰ کہ خود گاندھی جی بھی عرصہ تک "مقامی" سیاست کی حدود سے آگے بڑھنا پسند نہ کرتے تھے۔ لیکن رفتہ رفتہ کانگریس کے حلقہ میں ایسے لوگ آئے جو باہر کی دنیا سے بھی ربط رکھتے تھے۔ مثلاً مولانا محمد علی، ڈاکٹر انصاری، حکیم اجمل خاں اور مولانا ابوالکلام آزاد۔ اِن لوگوں نے کانگریس کے دائرۂ نظر کو وسیع کرنا شروع کیا اور آخرکار سب سے زیادہ پنڈت جواہرلال نہرو اور مولانا نے ہندستان کی قومی زندگی کا دامن عالمگیر سیاست کے مسائل سے باندھ دیا۔ یہ دونوں لیڈر غیر ممالک سے شخصی تعلقات بھی رکھتے تھے اور بین الاقوامی سیاست کے مطالعہ میں بھی ہمیشہ مصروف رہے۔ وہ سمجھتے تھے کہ ہندستان کو ایک دن آزاد ہو کر بین الاقوامی سیاست کی تمام اُلجھنوں میں اُلجھنا ہے۔ وہ ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم اور ۱۹۳۹ء کی دوسری جنگ کے آغاز میں دیکھ چکے تھے کہ ہندستان پر ان بین الاقوامی زلزلوں کا ردِ عمل محکومی کی حالت

میں کیا ہوا ہے اور آزادی کی حالت میں کیا ہوگا۔ آج **جواہر لال نہرو**
کا وجود سب سے زیادہ اس ملک کے لئے باعث تقویت اور وجہ افتخار
اسی لئے ہے کہ اُس کی حیثیت بین الاقوامی ہے اور **ہندستان** کی
آواز جب **جواہر لال** کے لب پر آتی ہے تو ہماری سرحدوں اور سات
سمندروں کے پار بین الاقوامی سیاست کے درو دیوار سے ٹکراتی ہے
اور اُن حجروں اور خلوتوں میں گونجتی ہے جہاں چند سال پہلے ہندستان
کے نام سے بھی بڑے بڑے عقلاء اور ارباب سیاست واقف نہ تھے۔

۱۴

جنگ نے جو حالات پیدا کئے اُن سے **لیگ** اور **کانگریس**
نے مختلف طریقوں سے بعض نتائج اخذ کئے۔ کانگریس نے یہ طے کیا
کہ اب آزادی کے مطالبہ کی تکمیل کا وقت آگیا۔ اور لیگ کی قیادت نے
طے کیا کہ اب ہندستان کو تقسیم کرا کے مسلمانوں کے لئے ایک جداگانہ
وطن مخصوص کرا لینا ہے۔ ایک ایسا وطن جہاں بلا شرکت غیرے
لیگ کے لیڈروں کا راج ہو! سنہ ۴۰ء میں لیگ نے لاہور میں جو قرارداد
منظور کی اُس نے علحدگی اور تقسیم کی بنیاد قائم کردی اور اسی قرارداد
کے بطن میں اُس فتنۂ عظیم کا تخم جاگزیں ہوا جس نے ۵ سال بعد سنہ ۴۷ء

میں شمال سے جنوب تک سارے ملک میں خون کے دریا بہا دئے صرف بدمعاشوں اور غنڈوں کے خون کے دریا ہی نہیں بلکہ بچوں اور عورتوں اور معصوموں کے خون کے دریا! لیگ کے اس مسلک کا فوری ردعمل یہ ہوا کہ مونجے اور ساورکر اور دوسرے فرقہ پرست ہندو لیڈروں کی تائید سے مہا سبھا نے غیر معمولی تقویت حاصل کی اور فرقہ وارانہ اختلافات میں ایسی شدت اور تلخی پیدا ہوئی جو اس سے پہلے کبھی نہ تھی۔ اب نئے نئے سوالات پیدا ہونے لگے اور مسٹر جناح کی جداگانہ قومیت کے تصور کا جواب اب کلہ بہ کلہ ہندو فرقہ پرستوں کی طرف سے بھی دیا جانے لگا۔ بھائی پرمانند صاف صاف کہنے لگے کہ "ہندوستان صرف ہندوؤں کا ملک ہے، اور مسلمان، عیسائی اور دوسرے فرقے تو محض ہمارے مہمان ہیں، وہ یہاں اُس وقت تک ہی رہ سکتے ہیں جب تک مہمان بن کر رہنا چاہیں"۔ اُنہوں نے یہ بھی کہدیا کہ "اردو ایک غیر ملکی زبان ہے جو ہماری غلامی کی زندہ یادگار ہے، اسکو صفحۂ ہستی سے مٹا دینا چاہیئے، اردو ملیچھوں کی زبان ہے جس سے ہمارے قومی مفاد کو نقصان پہنچا ہے"۔ یہ نئی نئی آوازیں ہر طرف سے سُنی جانے لگیں۔ مسٹر جناح اور لیگ کے نعروں کے جواب میں مہا سبھائی گنبد کی یہ آواز اور بھی زیادہ تیز اور بلند ہو گی اور اس طرح ہندوستان کی تقسیم، پاکستان کی پیدائش اور "ہندواستھان" کے مطالبہ کے جھنڈے ہر طرف نصب ہو گئے۔

جولائی ۳۷ء میں کانگریس نے جو صوبائی وزارتیں بنائی تھیں، اُن سے ایک اور جھگڑے اور فتنے کی بنیاد قائم ہوئی۔ اس موقعہ پر سب سے زیادہ صوبجات متحدہ میں کانگریس کے خلاف ہنگامہ شروع ہوا جس کا ایک خاص سبب یہ تھا کہ اس صوبہ کے بعض مسلم لیگی لیڈر جو وزارت میں شامل ہونے کے خواہشمند تھے شامل نہ ہوسکے۔ وہ تو یہاں تک تیار تھے کہ وزارت کی خاطر لیگ کے مسلک کو ترک کرکے کانگریس میں شریک ہو جائیں۔ لیکن کانگریس نے اُن کی شرکت پسند نہ کی۔ لہٰذا یہی صوبہ سب سے زیادہ میدان کارزار بنایا گیا۔ ساتھ ہی ساتھ دوسرے صوبوں میں بھی فرقہ داری مفسدہ نے پہلے سے زیادہ سر اُٹھایا۔ اس طرح لیگ کو ۴۰ء کے رزولیوشن کے فضا تیار کرنے کا موقعہ مل گیا۔ جب ۳۹ء میں کانگریسی وزارتوں نے استعفیٰ دیدیا تو لیگ نے ملک کے طول وعرض میں "یوم نجات" منایا۔ چونکہ کانگریس کے استعفیٰ کا سبب برطانوی حکام کی حکمت عملی سے وزارتوں کا اختلاف تھا اس لئے لیگ کا "یوم نجات" برطانوی حکمت عملی کی تائید کا ایک مظاہرہ بن گیا اور کانگریس کے زیادہ سنجیدہ حلقوں کے اس خیال کی تصدیق ہوگئی کہ لیگ کے مسلک کا ایک ضروری جزو انگریز کی حمایت اور اپنے لئے اُس کی تائید اور سرپرستی حاصل کرنا ہے۔

اس پانچ سال کے ہنگامہ پرور دور میں لیگ کی قیادت عظمیٰ کے تعصبات بار بار **مولانا** کے نظریات سے ٹکراتے رہے۔ عوامی زندگی میں

اشخاص اور افراد کی خصوصیات کا مقابلہ اور موازنہ بہت نازک اور مشکل کام ہے اور ایک سوانح نگار کو تو جہاں تک ممکن ہو ایسے مباحث سے دامن بچا کر نکل جانا چاہیئے۔ لیکن اس حقیقت کو نظرانداز کرنا ممکن نہیں کہ ہندستان کے مسلمانوں کی زندگی کے اس دور میں جو ۱۹۴۰ء کی قرار داد لیگ کے بعد سے شروع ہوا، اُن کی قسمت کا آخری فیصلہ اُن کی ملت کے دو بڑے آدمیوں پر منحصر ہو گیا جو دو ایسی انتہاؤں پر جن کے درمیان بعدالمشرقین تھا اپنے افکار کی تمام تر طاقت صرف کر رہے تھے۔ ایک طرف **مسٹر جناح** تھے جو ہندستان کو تقسیم کرا کے ـــ اور خود مسلمانوں کی عددی طاقت کو تقسیم کرا کے ـــ اپنا ایک جداگانہ "وطن" قائم کر لینا چاہتے تھے جس کے اندر شریعت اسلامی کے احیا کا پرفریب وعدہ لیگ کے لیڈروں نے اپنی قوم سے کیا تھا۔ اور دوسری انتہا پر **مولانا** تھے جو دو قومی نظریہ کو ملت اسلامی کی بربادی قرار دیتے تھے۔ **مولانا** کی پوری زندگی کا اساس ـــ جس میں ایک لمحہ بھی مستثنیٰ نہیں کیا جا سکتا ـــ مشترکہ قومیت کا تخیل تھا اور وہ اُن خطرات کو صاف دیکھ رہے تھے جو دو قومی نظریہ میں ۱۰ کروڑ مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کے لئے مضمر تھے۔ آج جبکہ ہندستان میں ۴ ۱/۲ کروڑ مسلمان پاکستان کے باہر رہ کر اور دو قومی نظریہ کا شکار بنکر اپنے بگڑے ہوئے گھر کی مسمار دیواروں کے ڈھیر پر بیٹھے ہوئے ہیں اور اپنی زندگی کو از سرِ نو اس سانچہ میں ڈھالنا چاہتے ہیں جو **مولانا** نے اُن کے لئے تجویز کیا ہے،

انہیں یہ بات ہر لمحہ یاد آ رہی ہے کہ پاکستان کے ۔ قائد اعظم نے پاکستان کے مفاد پر ہندستان کے مسلمانوں کی تقریباً آدمی آبادی کو قربان کر ڈالا ہے ۔ درحقیقت اُنہوں نے اس مشتبہ سودے میں جو برطانوی سیاست سے کیا گیا ۔ ۴½ کروڑ مسلمانوں کے مستقبل کو محسوب ہی نہیں کیا ۔ اب یہ حقیقت بھی ہندی مسلمانوں کے بہکائے ہوئے دلوں پر روشن ہو رہی ہے کہ جداگانہ قومیت کے فتنہ انگیز تخیل میں جو خطرات **مولانا** کو نظر آرہے تھے وہ حقیقی تھے ۔ اور اگر **مولانا** کی آواز تنگ نظری اور فرقہ پرستی کے نقار خانہ میں سُنی گئی ہوتی تو آج مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کا شیرازہ اس طرح برہم نہ ہوتا جس طرح کہ ہو گیا ہے بہر حال اب جبکہ تقسیم اور دو قومی نظریہ کی بحث ختم ہو چکی ہے اُس کے نتائج کو صحیح معیار بنا کر ہم یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ مسلک کس کا صحیح تھا ، **مولانا کا یا مسٹر جناح** کا ــــ ؟

البتہ اس تمام فتنہ و فساد میں فتح اگر کسی کو حاصل ہوئی تو وہ سب سے زیادہ پھر ایک دفعہ برطانوی تدبیر کو حاصل ہوئی جس نے ہندستان کے دو ٹکڑے کرا کے اُس کی کمزوریوں میں اپنے سیاسی اثرات کے مزید تحفظ کی ضمانت حاصل کر لی ! خود **مولانا** کی زندگی کے اصولوں نے بھی اس شکست آرزو میں ایک فتح تو ضرور حاصل کی ۔ یعنی دنیا کو ایک دفعہ پھر اس حقیقت سے روشناس کر دیا کہ جو کچھ وہ عمر بھر کہتے رہے اور مانگتے رہے وہی صحیح تھا ، اور جو کچھ پیش آیا وہ اپنے ساتھ مستقبل کے ایسے

خطرناک امکانات بھی لایا جن کو مولانا نے بہت پہلے دیکھ لیا تھا۔
ٹھیک اُسی زمانہ میں جب مسٹر جناح نے دو قومی نظریہ اور تقسیم کا سنگ بنیاد نصب کیا مولانا ایک دفعہ پھر کانگریس کے صدر منتخب ہوئے۔ اُنہوں نے اپنے خطبۂ صدارت کو شروع اِن الفاظ سے کیا تھا کہ:۔

"۲۳ء میں مجھے آپ نے اس قومی مجلس کا صدر چنا تھا۔ اب ۱۷ برس بعد دوسری دفعہ آپ نے مجھے یہ عزت بخشی ہے۔ قومی جدوجہد کی تاریخ میں سترہ برس کی مدت کوئی بڑی مدت نہیں ہے لیکن دنیا نے اپنی تبدیلیوں کی چال اس قدر تیز کر دی ہے کہ اب وقت کے پُرانے اندازے کام نہیں دے سکتے۔ اس ۱۷ برس کے اندر ایک کے بعد ایک بہت سی منزلیں ہمارے سامنے آتی رہیں۔ ہمارا سفر دور کا تھا اور ضروری تھا کہ ہم مختلف منزلوں سے گزرتے۔ ہم ہر منزل میں ٹھہرے مگر رُکے نہیں، ہم نے ہر مقام کو دیکھا بھالا مگر ہمارا دل اٹکا کبھی نہیں، ہمیں طرح طرح کے اتار چڑھاؤ پیش آئے مگر ہر حال میں ہماری نگاہ سامنے کی طرف رہی۔ دنیا کو ہمارے ارادوں کے بارے میں شک رہے ہوں مگر ہمیں اپنے

فیصلوں کے بارے میں کبھی شک نہیں رہا۔ ہمارا راستہ مشکلوں سے بھرا تھا۔ ہمارے سامنے قدم قدم پر رکاوٹیں کھڑی تھیں، ہم جتنی تیزی سے چلنا چاہتے تھے نہ چل سکے ہوں لیکن ہم نے آگے بڑھنے میں کوئی کوتاہی نہیں۔ اگر ہم سنہ ۲۳ء اور سنہ ۴۰ء کی درمیانی مسافت پر نظر ڈالیں تو ہمیں اپنے پیچھے بہت دُور ایک دُھندلا سا نشان دکھائی دیگا۔ سنہ ۲۳ء میں ہم اپنی منزل مقصود کی طرف بڑھنا چاہتے تھے مگر منزل ہم سے اتنی دور تھی کہ اُس کی راہ کا نشان بھی ہماری آنکھوں سے اوجھل تھا، لیکن آج نظر اُٹھائیے اور سامنے کی طرف دیکھیئے، نہ صرف منزل کا نشان صاف صاف دکھائی دے رہا ہے بلکہ منزل بھی دُور نہیں ہے۔ البتہ یہ ظاہر ہے کہ جوں جوں منزل نزدیک آتی جاتی ہے ہماری جد و جہد کی آزمائشیں بھی بڑھتی جاتی ہیں...... بہت ہی نازک مرحلے سے ہمارا کارروان گذر رہا ہے۔ ایسے مرحلوں کی سب سے بڑی آزمائش اُن کے متضاد امکانوں میں ہوتی ہے۔ بہت ممکن ہے کہ ہمارا ایک صحیح قدم ہمیں منزل مقصود سے بہت قریب کر دے اور بہت ممکن ہے

کہ ایک غلط قدم طرح طرح کی نئی مشکلوں میں اُلجھا دے
ایسے نازک وقت میں آپ نے مجھے صدر چن کر مجھ
پر جس بھروسہ کا اظہار کیا ہے وہ یقیناً بڑے سے بڑا
بھروسہ ہے جو ملک کی خدمت کی راہ میں آپ اپنے ایک
ساتھی پر کر سکتے تھے۔

اپنے اس خطبہ صدارت میں **مولانا** نے کانگریس کی گذشتہ جد وجہد پر ایک جامع تبصرہ کرتے ہوئے اُس کے اس ارادہ کا صاف صاف اعلان کیا کہ:-

"آج ہم اُس جگہ کھڑے ہیں جہاں ہمیں فیصلہ کرنا ہے
کہ اُس رُخ کی طرف آگے بڑھیں یا پیچھے ہٹیں جب
قدم آگے اُٹھا دیا جائے تو وہ رُک نہیں سکتا۔ اگر
رُکے گا تو پیچھے ہٹیگا۔ ہم پیچھے ہٹنے سے انکار کرتے ہیں،
ہم صرف یہ کر سکتے ہیں کہ آگے بڑھیں۔ مجھے یقین ہے
کہ میں آپ سب کے دلوں کی آواز اپنی آواز کے
ساتھ ملا رہا ہوں جب میں یہ اعلان کرتا ہوں کہ ہم
آگے بڑھیں گے۔"

اقلیتوں اور خصوصاً مسلمانوں کا ذکر کرتے ہوئے اُنہوں نے اسلام کے ساتھ اپنی وابستگی پر فخر کرتے ہوئے فرمایا کہ:-

"میں اس بات پر بھی فخر کرتا ہوں کہ میں ایک ہندستانی

ہوں اور ناقابل تقسیم اور متحدہ ہندستانی قومیت میں
شامل ہوں .... گیارہ صدیاں گذر گئی ہیں اور
ہندستان کی سرزمین سے اسلام بھی اسی طرح
وابستہ ہے جس طرح کہ ہندو دھرم۔ اگر اس ملک
کے باشندوں کا ہندو دھرم کئی ہزار سال سے یہاں
موجود ہے تو ایک ہزار سال سے اسلام بھی ہندستانیوں
کا مذہب بن چکا ہے۔"

مسلمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے اُنہوں نے فرمایا کہ ۱۰ کروڑ کی آبادی کو اقلیت قرار دینا بنیادی طور پر ایک غلط نظریہ ہے جس کے تحت مسلمانوں کے دلوں میں ایک احساس کمتری پیدا کیا گیا ہے

"کیا ہندستان کے مسلمان ہندستان کے مستقبل
کو شبہ خوف اور بے اعتمادی کی نظر سے دیکھتے ہیں
یا جرات واعتماد کے ساتھ؟ اگر ہم خوف اور شبہ کی
نظر رکھتے ہیں تو بلاشبہ ہمیں کوئی دوسرا راستہ
اختیار کرنا پڑے گا۔ کوئی حالیہ اعلان یا مستقبل کے
متعلق کوئی وعدہ اور کوئی "تحفظ" ہمارے شبہ
اور خوف کا علاج نہیں ہو سکتا .... اس
حالت میں تو ہمیں ایک تیسری قوت کو کے وجود کو گوارا
کرنا ہوگا ...... لیکن اگر ہمیں اس بات کا یقین ہے،

کہ خوف اور شبہ کا کوئی مقام ہماری زندگی میں نہیں
تو ہمیں مستقبل کی طرف جرأت اور خوداعتادی کے
ساتھ دیکھنا چاہیئے۔ اس صورت میں ہمارا راستہ بالکل
واضح ہوجاتا ہے۔ اس وقت ہمارا فرض ہوجاتا ہے
کہ ہندستان کے قومی مطمح نظر کی طرف بڑھیں "

اس خطبہ کے آخری الفاظ آج بھی ہندستان کے مسلمانوں اور ہندؤوں کے لئے اسی طرح شمعِ ہدایت ہیں جس طرح کہ ۰ سال پہلے تھے مولانا آج سے ۰ سال پہلے صاف دیکھ رہے تھے کہ ہندوؤں کی ایک جماعت میں رجعت پسندی کے جذبات اُبھر رہے ہیں اور اس Revivalism کے خطرات اُن کی نظر سے پوشیدہ نہ تھے خطبہ کے آخری پیراگراف میں **مولانا** نے اس صورت حال کی طرف اشارہ کرکے متحدہ قومیت کے اساس پر اِن الفاظ میں زور دیا تھا کہ:۔

"صدیوں کی مشترک تاریخ نے ہماری ہندستانی
زندگی کے تمام گوشوں کو اپنے تعمیری سامانوں سے بھر
دیا ہے۔ ہماری زبانیں، ہماری شاعری، ہمارا ادب،
ہماری معاشرت، ہمارا ذوق، ہمارا لباس، ہمارے
رسم ورواج، ہماری روزانہ زندگی کی بیشمار حقیقتیں
کوئی گوشہ بھی ایسا نہیں ہے جس پر اس مشترک
زندگی کی چھاپ نہ لگ سکی ہو۔ ہماری بولیاں الگ

نہیں، مگر ہم ایک ہی زبان بولنے لگے، ہمارے رسم و رواج ایک دوسرے سے بیگانہ تھے مگر انہوں نے مل جل کر ایک نیا سانچہ پیدا کر لیا۔ ہمارا پرانا لباس تاریخ کی پرانی تصویروں میں دیکھا جا سکتا ہے مگر اب وہ ہمارے جسموں پر نہیں مل سکتا۔ یہ تمام مشترک سرمایہ ہماری متحدہ قومیت کی ایک دولت ہے اور ہم اُسے چھوڑ کر اُس زمانہ کی طرف لوٹنا نہیں چاہتے جب ہماری یہ ملی جلی زندگی شروع نہیں ہوئی تھی۔ ہم میں اگر ایسے ہندو دماغ ہیں جو چاہتے ہیں کہ ایک ہزار برس پہلے کی ہندو زندگی واپس لائیں تو اُنہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ وہ ایک خواب دیکھ رہے ہیں اور وہ کبھی پورا ہونے والا نہیں۔ اسی طرح اگر ایسے مسلمان دماغ موجود ہیں جو چاہتے ہیں کہ اپنی گذری ہوئی تہذیب و معاشرت کو پھر تازہ کریں جو وہ ایک ہزار برس پہلے ایران اور وسط ایشیا سے لائے تھے تو میں اُن سے کہونگا کہ وہ اس خواب سے جسقدر جلد بیدار ہو جائیں بہتر ہے۔ کیونکہ یہ ایک غیر قدرتی تخیل ہے اور حقیقت کی سرزمین میں ایسے خیالات اُگ نہیں سکتے ...... ہماری اس ایک ہزار برس کی مشترک زندگی نے ایک متحدہ قومیت کا سانچہ ڈھال دیا ہے۔ ایسے سانچے بنائے نہیں جا سکتے

> وہ قدرت کے مخفی ہاتھوں سے صدیوں میں خود بخود بنا
> کرتے ہیں۔ اب یہ سانچا ڈھل چکا ہے اور قسمت کی مہر
> اُس پر لگ چکی . . . .

مولانا نے ۱۹۴۰ء میں ہندو Revivalism کے اس خطرے سے واقف تھے۔ وہ خطرہ زیادہ طاقتور صورت میں آج ہمارے سامنے ہے اور بلاشبہ اُس طاقت میں **مسٹر جناح** کے "دو قومی نظریہ" نے بہت اضافہ کیا ہے لیکن اس قدرتی سانچہ کو توڑنے کے آج سوائے اس کے کوئی معنیٰ نہیں ہو سکتے کہ ہم عالمگیر اور بین الاقوامی ارتقا سے ٹکر لیکر شکست کھائیں اور آزاد ہندستان کو ایک لحہ کی آزادی کے بعد پھر غلامی کی خندق میں ڈال دیا جائے۔ جس وقت **مولانا** اس غیر فطری تخیل کی مذمت کر رہے تھے عین اُسی وقت **مسٹر جناح** صاف صاف کہہ رہے تھے کہ وہ مسلمانوں کی قسمت کے فیصلے کو **ہندستان** کی قسمت کے فیصلہ سے وابستہ نہیں کر سکتے اور یہ کہ "مسلمانوں کو خود ایک جداگانہ قوم کی حیثیت سے اپنی قسمت کا فیصلہ کرنا ہوگا"۔ واقعات نے بتا دیا ہے کہ جو فیصلہ پاکستان کے مسلمانوں نے اپنی قسمت کا کیا ہے اُس کی قیمت زیادہ تر **ہندستان** کے مسلمانوں کو ادا کرنی پڑی ہے اور پھر بھی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ خود پاکستان کا مستقبل بغیر اس تیسری قوت کے محفوظ ہے جس کی طرف **مولانا** نے اپنے خطبہ صدارت میں اشارہ کیا تھا اور جس نے ہندستان کی آزادی کو تقسیم کے حربے سے کافی مجروح کر کے اپنے سامراج کی گرتی

ہوئی عمارت کی چند دیواروں کو مسمار ہونے سے بچا لیا ہے!!

۱۵

اسی زمانہ میں کانگریس کی عاملہ کے سامنے **گاندھی جی** نے یہ سوال پیش کر دیا کہ اب وہ طے کرے کہ آئندہ تشدد اور عدم تشدد کے متعلق اُس کا مسلک کیا ہوگا۔ یہ سوال اس لئے پیدا ہوا کہ جنگ میں اتحادیوں کی مدد کرنے کے مسئلہ میں تشدد اور عدم تشدد کی شرائط پیدا ہوتی تھیں۔ نیز یہ سوال بھی پیش آ گیا تھا کہ اگر کانگریس نے ملک کے نظم و نسق کو اپنے ہاتھ میں لیا تو وہ تشدد کے اصول پر عمل کرے گی یا عدم تشدد کے۔ مجلس عاملہ کے لئے اُس وقت کے حالات میں یہ سوال بہت پیچیدہ اور نازک تھا اور وہ اُس کے متعلق اپنے کسی فیصلہ کا اعلان کرنے پر آمادہ نہ تھی۔ ظاہر ہے کہ **مہاتما جی** کے لئے کانگریس کی عاملہ کا یہ تذبذب خوشگوار نہ تھا لیکن جب مجلس کے اراکین نے عدم تشدد کے مسلک کے متعلق بحالات موجودہ اپنی غیر آمادگی کو ظاہر کر دیا تو **گاندھی جی** نے اُن کی صاف گوئی اور دیانت پر انہیں مبارکباد دی اور مشورہ دیا کہ کانگریس حکومت کے ساتھ جنگ میں تعاون کرنے کا وعدہ کرلے بشرطیکہ ملک کو فوراً آزادی دیدی جائے۔ عاملہ اور **گاندھی جی** کے درمیان اس اصولی بحث میں **مولانا** نے عاملہ کا

کا ساتھ دیا اور یہ شاید پہلا موقعہ تھا کہ **مولانا** اصول کے معاملہ میں **گاندھی جی** کے رجحانات سے علیحدہ ہوئے۔ لیکن وہ کسی قیمت پر بھی آزادی چاہتے تھے۔ **گاندھی جی** سے اُن کی رائے کا یہ اختلاف پھر بھی محبت اور اخلاص کے اُس ربط کو متاثر نہ کرسکتا تھا جس کی بنیاد پر اُن کے اور **گاندھی جی** کی مادی، ذہنی اور روحانی زندگی کے دھارے متوازی اور پہلو بہ پہلو بہتے رہے تھے۔

مہادیو ڈیسائی مرحوم نے **مولانا** کے متعلق اپنی کتاب میں اس واقعہ کا ذکر کیا ہے کہ جب ایک دفعہ اُنہوں نے مولانا سے سوال کیا کہ **گاندھی جی** سے اُن کی وابستگی کا حقیقی سبب کیا ہے تو مولانا نے فرمایا کہ "قطع نظر **گاندھی جی** کی ذکاوت و فراست کے اس وابستگی کا بڑا سبب اُن کی بے لوث صداقت ہے۔ لیکن پھر بھی میں ۲۶ء تک **گاندھی جی** کے افعال پر ناقدانہ نظر ڈالا کرتا تھا۔ تاآنکہ میں نے **ینگ انڈیا** میں اُن کا ایک مضمون پڑھا جسمیں انہوں نے مسز گاندھی کی ایک ذراسی فروگذاشت پر تنقید کرتے ہوئے اپنی روح کو عریاں کردیا تھا۔ ہوا یہ تھا کہ مسز گاندھی کسی تحفہ کو جو اُنہیں ملا تھا آشرم کے مہتمم کو دینا بھول گئی تھیں تب میں نے سوچا کہ یہ شخص حق کا اتنا پاسدار ہے کہ اُس کے دشمن بھی اُس کی صداقت پر شبہ نہیں کرسکتے اور مجھے تعجب ہوا کہ یہ حق پرستی کتنی دور تک جاسکتی ہے۔"

کانگریس کی ہائی کمانڈ میں جو مہاتما گاندھی کے فلسفۂ سیاست

کو اپنی سیاست کا اساس بنا چکا تھا جواہرلال اور مولانا کا مقام گاندھی جی سے جس قدر قریب تھا شاید اُس وقت بابو راجندر پرشاد کے علاوہ اور کسی کا نہ تھا۔ ۱۹۴۲ء میں جب امریکہ کا مشہور صحیفہ نگار اور مصنف جان گنہتر، ہندستان آیا تو اُس نے اپنی کتاب Inside Asia میں کانگریس کی ہائی کمانڈ کی شخصیات کے متعلق اپنے تاثرات پیش کئے۔ یہ کہنا تو مشکل ہے کہ وہ تصورات اندرونی طور پر کلیتاً صحیح تھے لیکن بیرونی طور پر ایک غیر ملکی ناقد و ناشر کی رائے کی حیثیت سے دلچسپ ضرور ہیں۔ گنہتر نے لکھا تھا کہ:۔

" اس تثلیث کے منطقہ میں (جو گاندھی جی کے گرد وپیش پیدا ہوگئی تھی) مولانا ابوالکلام آزاد پٹیل سے اس قدر مختلف ہیں جس قدر کہ قیاس کیا جا سکتا ہے۔ یہ دونوں قطعاً دو مختلف دنیاؤں کی نمایندگی کرتے ہیں۔ مولانا جن کی عمر پچاس سال ہے ایک عالم دین اور فلاسفر ہیں۔ وہ مشرق کے بزرگ ترین علماء و فضلاء میں سے ایک ہیں۔ اُن کی روشن خیالی مطالعہ کتب کے گہرے ذوق سے وابستہ ہے۔ وہ ایک علامہ ہیں اور ایک جدید تفسیر قرآن کے مفسر ہیں .... آزاد راسخ العقیدہ ہیں لیکن تجدد پسند ہیں۔ اسلام کی نسبت اُن کا زاویہ نظر

مسلمانہ ہے .... وہ اُن چند ہندستانیوں میں سے
ہیں جنہوں نے گاندہی جی کے سیاسی میدان مین
قدم رکھنے سے پہلے ہی جدوجہد شروع کردی تھی ....
...... آزاد کی بے مثل خصوصیت یہ ہے کہ اُن کے
اندر قدیم ٹکسالی تربیت اور جدید وسعت نظر کا ایک
مرکب بن گیا ہے .... اگر پٹیل کانگریس کی اس
تثلیث کا ایک زبردست مُکا ہیں اور مولانا اُس کے
دماغ اور روحانی روشنی کا ایک جزو تو بابو راجندر
پرشاد اُس کا دل ہیں ...."

اس "تثلیث" میں گنہتر نے مولانا کو جس نظر سے دیکھا ہے وہ بڑی حد تک صحیح معلوم ہوتی ہے اس لئے کہ گاندہی جی کے ساتھ مولانا کا روحانی ربط ہی محبت کی اس سنہری زنجیر کی سب سے مضبوط کڑی تھا۔ اور مولانا کی یہ خصوصیت ہائی کمانڈ کے دوسرے شرکاء کو اس درجہ تک حاصل نہ تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ مولانا کی ذہنی زندگی میں گاندہی جی کا ایک مخصوص مقام تھا اور شاید اس سے بڑا کوئی المیہ اور اس سے زیادہ دلخراش کوئی سانحہ مولانا کی زندگی میں پیش نہیں آیا جتنا کہ مہاتما گاندہی کی وفات ہے۔ ہندستان کی تاریخ میں دو خون آلود ورق ایسے ہیں جن کے دھبوں کو صدیوں تک نہیں دھویا جا سکتا۔ ہندستانی تہذیب وتمدن کی ترقی کے بہت سے دور

یکے بعد دیگرے گزر جائیں گے تب شاید اِن شرمناک دھبوں کا رنگ ہلکا ہو سکے۔ ایک دھبہ تو مہاتما جی کے قتل کا دھبہ ہے جس نے وطن کی تہذیب و تمدن کا سر نیچا کر دیا اور دوسرا دھبہ ۱۵ اگست سے پہلے اور بعد کے وہ فرقہ داری فسادات ہیں جن میں لاکھوں عورتوں اور بچوں کو حیوانی ظلم و ستم اور درندگی کا ہدف بنایا گیا۔ انسانیت کے خلاف ہندستان اور پاکستان کے ان گناہوں کا کفارہ بہت عرصہ تک اس ملک کے ہندو اور مسلمانوں کو ادا کرنا ہے۔

جو لوگ مولانا کی زندگی کے اس غمگین دور میں اُن سے کسی قدر قریب رہ سکے وہ جانتے ہیں کہ پنجاب اور دہلی کے خوفناک فتنہ اور مہاتما جی کے قتل نے مولانا کی زندگی کا رس نکال لیا۔ اُنہوں نے عین آزادی کے لمحوں میں ایک طرف تو فرقہ داری اتحاد اور متحدہ ہندستان کے اُن تصورات کی عمارت کو مسمار ہوتے دیکھا جنکی تعمیر میں اُن کے دل و دماغ کی بہترین صلاحتیں صرف ہوئی تھیں اور دوسری طرف خود اپنے اُس محبوب معمار کو قاتل کے سامنے خاک و خوں میں تڑپتے دیکھا جس نے آزاد ہندستان کی یہ نئی دنیا بنائی تھی۔ زندگی کی یہ منزل مولانا کے لئے بہت ہی صبر آزما ہے اور غم کا یہ جام جو اُنہیں پینا پڑا بہت تلخ ہے۔ لیکن دور سے دیکھنے والا کوئی شخص بھی مولانا کی سنجیدہ اور منظم زندگی میں اِن تاثرات کا نشان نہیں پا سکتا اُن کا سنجیدہ اور خاموش ظاہر اُن کے مجروح باطن پر حاوی ہے!

16

سنہ ۴۰ء میں جب مولانا نے پھر ایک دفعہ کانگریس کی صدارت کی ذمہ داریاں قبول کرلیں تو گاندھی جی کی غیر مشروط قیادت میں ستیہ گرہ کی ایک اور مہم شروع ہوئی اور پھر مولانا ۱۰ ماہ کی سزا پاکر جیل میں چلے گئے۔ ستیہ گرہ کی یہ مہم سنہ ۴۱ء میں بھی جاری رہی۔ مگر جب پرل ہاربر پر جاپانیوں کے کامیاب حملے نے جنگ کو تقریباً عالمگیر بنا دیا اور یہ سیلاب مشرق بعید کی سمت سے براہِ راست ہندستان کی طرف بڑھنے لگا تو برطانیہ نے جسکی قوت جنگ کے پہلے ہی سال میں بہت مجروح ہو چکی تھی ہندستان کی ہمدردانہ تائید کا حاصل کرنا اپنے لئے ناگزیر سمجھا۔ تب پھر مولانا اور دوسرے قیدی رہا کئے گئے اور وایسرائے نے تمام ملک سے اپیل کی کہ اس بڑھتے ہوئے خطرہ کے مقابلہ میں ایک متحدہ محاذ قائم کیا جائے۔ اس متحدہ محاذ کو مستحکم بنانے کے لئے کانگریس اور لیگ کا اتحاد بھی ضروری تھا لیکن مسٹر جناح نے ایک دفعہ پھر صاف صاف کہہ دیا کہ لیگ اور کانگریس کا اشتراک عمل اس وقت تک ممکن نہیں جبتک کہ کانگریس، پاکستان کے نظریہ کو قبول نہ کرلے۔ چند ہی روز بعد رنگون پر دشمن نے قبضہ کرلیا اور اب ایک حالت اضطراب میں

برطانوی حکومت نے اسٹیفورڈ کرپس کو ہندستان بھیجا۔ کرپس نے کانگریس اور لیگ کے لیڈروں کے سامنے آزادی کی یہ تجویز رکھی کہ ہر صوبہ کو یہ اختیار تمیزی دیدیا جائے کہ وہ اپنے سیاسی مستقبل کا خود فیصلہ کرے۔ اور ہندستان کے دفاع کی نگرانی برطانیہ کے سپرد رہے لیکن یہ پیش کش کانگریس کے مطالبہ سے بہت کم تھی۔ چنانچہ مولانا نے اعلان کیا کہ وہ خود ملک کے دفاع کے لئے تلوار اٹھانے کو تیار ہیں بشرطیکہ ملک کی آزادی کا فوراً اعلان کردیا جائے۔ لیکن نہ تو کانگریس اور نہ خود مولانا کسی ایسی تجویز کو قبول کرنے پر آمادہ تھے جسکے تحت صوبوں اور ریاستوں کو ملک کی آزادی کے مطالبہ میں کسی قسم کی ترمیم کرنے کا اختیار دیا جائے۔ وہ ایسی ہر تجویز کو آزادی کی نفی قرار دیتے تھے۔

کرپس کے مشن کے متعلق مولانا کے جو تاثرات تھے اُن کا ایک دھندلا خاکہ امریکہ صحیفہ نگار لوئیس فشر کے روزنامچہ میں ہمیں نظر آتا ہے۔ اُس نے مولانا سے اپنی ملاقات کا حال اس طرح لکھا ہے کہ:

"لنچ کے بعد میں نے آزاد سے ملاقات کی .... آزاد جنہوں نے کرپس سے زیادہ گفت وشنید کی تھی فرمانے لگے کہ وہ کرپس سے مایوس ہوئے۔ اُنہیں یہ توقع تھی کہ کرپس ہندستان کے دوست ثابت ہوں گے۔ کرپس نے قطعی طور پر اُن سے کہا تھا کہ ہندستان میں ایک نئی قومی حکومت بنائی جائیگی

جو ایک ذمہ دار کابینہ کی حیثیت سے کام کریگی اور وِلیسرائے اُس کے کاموں میں اتنی ہی کم مداخلت کریں گے جتنا کہ انگلستان کے بادشاہ اپنی کابینہ کے معاملات کرتے ہیں اِسی مفروضہ کی بنا پر سر سٹیفورڈ سے گفت وشنید جاری رہی۔ ہندستان کے دفاع کے متعلق بھی سمجھوتہ کی ایک صورت طے ہو گئی تھی تاکہ برطانوی کمانڈر انچیف اور ہندستانی وزیر دفاع کے درمیان یہ فرائض تقسیم ہو سکیں۔ لیکن آزاد نے کہا کہ اس کے بعد ہی یکایک ۹ اپریل کو کرپس نے اُن سے کہا کہ برطانوی حکومت وِلیسرائے کے ویٹو کے اختیارات کو ختم کرنے پر آمادہ نہیں...... آزاد کا یہ خیال ہے کہ کرپس نے تو وعدہ کر لیا تھا مگر لندن نے اُس وعدہ کے ایفا کی اُن کو اجازت نہیں دی۔ میں نے جب اُن سے سوال کیا کہ اہل ہند کے احساسات اب کیا ہیں تو اُنہوں نے کہا کہ ایک حد تک تو یہ احساس بیچارگی کا احساس ہے۔ اُسی کے ساتھ ایک عنصر احتجاج کا ہے۔ لیکن زیادہ تر یہ خیال ہے کہ اب برطانوی حکومت سے گفت وشنید بیکار ہے۔ وہ اپنے اقتدار سے دستبردار ہونے پر آمادہ نہیں۔

"تقسیم" کی تجویز کے متعلق مولانا نے فقرے فرمایا تھا کہ "میں شادی سے پہلے طلاق کے کچھ معنی نہیں سمجھتا۔ اگر ہندو اور مسلمان یکجا زندگی بسر کرنے کی کوشش کریں اور ناکام رہیں تب ہی جدائی کا سوال پیدا ہوتا ہے۔" لیکن جدائی کا سوال تو تیسرے فریق کا پیدا کیا ہوا تھا جو عوام کی جہالت اور اُن کے لیڈروں کی خود غرضیوں سے فائدہ اُٹھا رہا تھا صرف اسی لئے نکاح سے پہلے طلاق کی یہ صورت پیش آئی۔

القصہ ایک طرف تو مولانا کے احساسات یہ تھے اور دوسری طرف مسٹر جناح نہ تو فوری اعلان آزادی کے مطالبہ پر مُصر تھے اور نہ کسی ایسی تجویز کو قبول کرنے پر آمادہ تھے جسمیں پاکستان کے نظریہ کو صراحتاً اور کلیتاً تسلیم نہ کر لیا گیا ہو۔ مولانا نے کرپس کی تجویز کا مطالعہ کرنے کے بعد کانگریس کی طرف سے یہ جواب دیا کہ وہ نہ تو اُن کی بنیادی تجویز کو قبول کر سکتے ہیں (جس کے اندر ملک کی تقسیم کے جراثیم موجود تھے)، اور نہ کسی ایسی مقامی حکومت کو تسلیم کر سکتے ہیں جسمیں مرکزی اختیارات عوامی نمایندوں کے بجائے بدستور وائسرائے کو حاصل رہیں۔

۲ مئی ۱۹۴۲ء کو آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا جلسہ ہوا اور مہاتما گاندھی کو کانگریس کے آیندہ طرز عمل کے متعلق پورے اختیارات دے دیئے گئے۔ کمیٹی کی قرارداد میں اس امر پر زور دیا گیا کہ ہندستان میں برطانوی حکومت فوراً ختم ہو جائے اور یہ کہ اگر ایسا نہ ہوا تو کانگریس

عدم تشدد کے حربہ سے کام لینے پر مجبور ہو گی۔ مہاتما گاندھی نے بھی کہدیا کہ اب کوئی درمیانی راستہ اختیار نہیں کیا جا سکتا۔ یا تو انگریز ہندستان کی آزادی کو تسلیم کریں یا ایسا کرنے سے انکار کر دیں۔ جولائی ۴۲ء میں پھر کانگریس نے ایک قرارداد منظور کی جسمیں انگریزوں سے کہا گیا کہ اب نکل جاؤ۔ مہاتما گاندھی نے اس موقعہ پر صاف کہدیا کہ "اگر آزادی کا تحفہ آسمان سے نہیں گرتا تو ہم لڑکر آزادی لیں گے"۔ مجلس عاملہ کے اس جلسہ کے فوراً بعد مولانا اور تمام کانگریسی لیڈر گرفتار کر لئے گئے۔ یہ نظر بندی ۹ اگست ۴۲ء سے ۱۵ جون ۴۵ء تک جاری رہی اس گرفتاری اور ۳۴ ماہ کی نظر بندی کے زمانہ کے تاثرات کا بہت دلچسپ خاکہ مولانا نے غبار خاطر کے اوراق پر پیش کیا ہے۔ "نقش ثانی" میں مولانا کے ادب پر جو کچھ لکھا گیا ہے اسی میں بعض معنی خیز اشارے مولانا کے اُن تاثرات کے متعلق بھی موجود ہیں۔

چند روز بعد جب لنلتھگو کا دور ختم ہوا اور لارڈ ویول ویسرائے بنا کر بھیجے گئے تو انہوں نے پھر از سر نو گفت و شنید کا آغاز کیا اور مہاتما گاندھی پھر رہا کر دئے گئے۔

اس کے بعد متعدد تجاویز پیش ہوتی رہیں لیکن گفتگوئے مفاہمت کی ہر ناؤ مسٹر جناح کی مجوزہ "تقسیم" کی چٹان سے ٹکرا کر غرق ہوتی رہی۔ خود مہاتما جی نے مسٹر جناح سے طویل ملاقاتیں کیں لیکن زمین اتنی بنجر تھی کہ اُس میں اس گفت و شنید کا کوئی تخم بھی

بارآور نہ ہو سکا۔ کرپس کی ابتدائی تجویز میں زہر صوبہ کو اپنے لئے فیصلہ کرنے کا اختیار، تقسیم اور پاکستان کے جو جراثیم موجود تھے اُن کے زہر کا کوئی تریاق کسی کے پاس موجود نہ تھا۔ نہ تو راجگوپال آچاری کا اور نہ تیج بہادر سپرو کا فارمولا مسٹر جناح کے تصورات کی اُس بنیاد کو ہلا سکا جن کا سنگِ بنیاد کرپس کی ابتدائی تجویز نے نصب کر دیا تھا۔

جون ۱۹۴۵ء میں لارڈ ویول نے یہ تجویز پیش کی کہ ایک ایسی مرکزی عاملہ تشکیل دی جائے جس میں ہر منظم جماعت کو نمایندگی حاصل ہو۔ لیکن ساتھ ہی یہ شرط لگا دی کہ فوج اور دفاع کے محکمے اس عاملہ کے اختیارات سے باہر رہیں گے اور اُن کی ذمہ داری صرف ولیسرائے سے متعلق ہوگی مقصد یہ تھا کہ ایک "آل پارٹیز" حکومت جاپان کے مقابلہ میں جنگ جاری رکھے اور اُسکو کامیاب بنانے کے لئے ملک کی تمام پارٹیوں اور جماعتوں کی ہدایت حاصل کر سکے۔ اس تجویز کے اعلان کے ساتھ ہی وہ سب کانگریسی لیڈر جو بمبئی کی آخری قرارداد کے ساتھ ہی گرفتار کر لئے گئے تھے ۳۴ ماہ کی نظر بندی کے بعد رہا کر دئے گئے۔ شملہ میں ایک کانفرنس شروع ہوئی اور اُس میں کانگریس نے **مولانا** کو پورے اختیارات کے ساتھ شریک ہونے کی اجازت دی۔ لیکن یہ کانفرنس بھی بالآخر ناکام رہی۔ **مولانا** مرکزی عاملہ کی رکنیت میں کانگریس کے نمایندوں کے ساتھ نیشنلسٹ مسلمانوں کے ایک نمایندے کو بھی نامزد کرنا چاہتے تھے۔ اس لئے کہ کانگریس اپنے اس دعوے سے دستبردار ہونے پر آمادہ نہ تھی کہ وہ ایک غیر فرقہ وارانہ

اور تمام فرقوں کی قومی جماعت ہے۔ کانگریس کا یہ دعوے مسٹر جناح کے دو قومی نظریہ کو مجروح کرتا تھا اس لئے اُنہوں نے کانگریس کی جانب سے نیشنلسٹ مسلمانوں کی نمائندگی کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کانفرنس کے آغاز ہی میں ایک وقت تو ایسا بھی آگیا تھا کہ مسٹر جناح مولانا کے ساتھ ایک ہی میز کے گرد بیٹھنے پر بھی آمادہ نہ تھے! کانگریس میں مولانا کا وجود ہی مسٹر جناح کے دو قومی نظریہ کے پہلو میں ایک تکلیف دہ کانٹے کی طرح کھٹک رہا تھا!

مسٹر جناح کی ضد سے مایوس ہو کر مولانا نے چاہا کہ اگر لیگ شریک ہونے پر آمادہ نہیں تو جو دوسری جماعتیں مرکزی حکومت کی مجوزہ تشکیل میں شریک ہونے پر آمادہ ہوں اُن ہی شریک کر کے مرکزی حکومت بنالی جائے۔ لیکن اس کے لئے ویسرائے تیار نہ تھے۔ ویسرائے کے اس انکار کا ردعمل کانگریس کے حلقوں میں کیا ہوا اس سے قطع نظر کر کے بھی عام طور پر یہ سمجھا گیا کہ برطانوی تدبر کوئی ایسی مرکزی حکومت قائم کرنا پسند نہیں کرتا جس میں اختلاف و تفریق کے امکانات باقی نہ رہیں! اس لئے کہ اس طرح تو دو قومی نظریہ کی تکمیل کا منصوبہ کمزور ہوا جاتا تھا!

اس گفت و شنید کے تمام دشوار گذار مرحلوں میں مولانا نے اپنے دل کی وسعت اور اپنی نظر کی بلندی کو کبھی ذاتی تعصبات سے متاثر نہ ہونے دیا۔ برطانوی پارلیمنٹ کے رکن سورنسن جب پارلیمانی وفد

کے ساتھ ہندستان آئے اور مولانا سے ملے تو انہوں نے اپنی کتاب Impressions of India میں مولانا کی نسبت اپنی یہ رائے ظاہر کی کہ

"اُن کے خیالات ہر وقت بیدار ہیں اور اُن کے متعلق طبیعت پر یہ اثر پڑتا ہے کہ وہ ایک فاضل حکیم و عارف ہیں .... وہ صلح پسند ہیں اور تنگ نظر قوم پرست نہیں ہیں اسی لئے کہ اُنہوں نے بار بار اس بات پر زور دیا کہ ہندستان کو دنیا کے مسائل میں حصہ لینا چاہیئے اور بین الاقوامی صلح اور امن کیلئے دوسروں کے ساتھ تعاون کرنا چاہیئے۔"

لیکن غیر ملکیوں کی نظر میں مولانا کی شخصیت جو کچھ تھی وہ خود اپنے ہم وطن اور ہم مذہب مسلمانوں کی نظر میں باقی نہ رہی تھی۔ اس لئے کہ لیگ نے ادنیٰ مذہبی تعصبات کو اپنا آلہ کار بنا کر ہر وسیع النظر انسان کے لئے مفاہمت کی جد و جہد کا میدان بہت تنگ کر دیا تھا۔ ان حالات میں ۱۹۴۶ء کی یہ رد و کد جاری رہی اور جب آخر کار لیگ نے بعض شرطوں کے تحت ایک مشترکہ عاملہ میں شریک ہونے پر آمادگی ظاہر کی تو اُسوقت ہندستان کے قوم پرست حلقوں میں لیگ کے اس فیصلہ کے متعلق کوئی غلط فہمی پیدا نہ ہو سکی۔ ہر شخص جانتا تھا کہ لیگ مرکزی عاملہ میں اس تجربہ کو ناکام بنانے کے لئے شریک ہوئی ہے اور اس کا مقصد صرف یہ

بتا دینا ہے کہ اب کانگریس اور لیگ کسی مشترکہ مرکز پر یکجا اور ہم آہنگ نہیں ہوسکتیں۔ مشترکہ مرکز کے اس تلخ تجربہ نے لیگ کے مقصد کی تکمیل کر دی اور کانگریس کو بھی با دل ناخواستہ اس حقیقت کو تسلیم کر لینا پڑا کہ جبتک "قائداعظم" کی "قیادت عظمیٰ" کا جھنڈا بلند ہے متحدہ ہندستان کا تصور کامیاب نہیں ہوسکتا۔ اسی نقطہ سے کانگریس کے اندر یہ احساس پیدا ہونے لگا کہ اب تقسیم اور جدائی کے سوا کوئی چارہ نہیں اور بغیر اس کے انگریز کے اقتدار کو ختم کرنے کی اور کوئی صورت نہیں ہوسکتی۔ آزادی کی اُس جد وجہد میں جو نصف صدی تک جاری رہی ہندستان کی انتہائی بدنصیبی کا نقطہ آغاز مشترکہ مرکز کی یہی تشکیل تھی جن میں آخری دفعہ برطانوی تدبر نے منظر عام پر اس بات کا مظاہرہ کرایا کہ ہندو اور مسلمان مشترکہ حکومت کی ذمہ داریوں کے اہل نہیں ہیں۔ ۱۴ اراکین کی مشترکہ کابینہ بنانے کا جو طریقہ ویسرائے نے اختیار کیا وہ بجائے خود اُن کی نیت کے فتور کا ثبوت تھا۔ بجائے اس کے کہ عام دستوری طریقے کے مطابق ویسرائے کسی ایک جماعت کو کابینہ بنانے کی دعوت دیتے اور مجوزہ وزیراعظم پر اراکین کابینہ کا انتخاب منحصر رکھتے اُنہوں نے شخصی طور پر تمام جماعتوں کے نمایندوں کا ایک ایسا مرکب تیار کیا جس کے اجزائی ترکیبی بلاشبہ اُن کے علم و یقین میں ایک لمحہ کیلئے بھی ہم آہنگ نہیں ہوسکتے تھے۔ بہر حال برطانوی تدبر دنیا کو یہ ایک

تماشہ بھی دکھا دینا چاہتا تھا اور اُس نے دکھا دیا۔ بہت بڑی اجتہادی غلطی کانگریس نے یہ کی کہ کابینہ کی اس غیر دستوری تشکیل میں شریک ہونا گوارا کر لیا۔ اُسی غلطی کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ بعد کو اُسے ملک کی تقسیم کا زہر بھرا پیالہ بھی پینا پڑا۔

کرپس کے بعد برطانوی کابینہ کے اس وفد کے متعلق یہ یقین کرنا دشوار نہیں کہ وہ ہندستان کے اتحاد کی ایک ایسی مشروط تائید کر رہا تھا جس کے اندر ملک کی تقسیم کا منصوبہ روپوش تھا۔ جس وقت اس وفد سے گفت و شنید جاری تھی اور مولانا آخری مرتبہ اپنے ملک کو تقسیم کی لعنت سے بچانے کی کوشش کر رہے تھے، مہاتما گاندھی جنہوں نے گفت و شنید کی اس منزل میں کوئی نمایاں حصہ لینا پسند نہیں کیا تھا، اپنی پرارتھنا کی تقریروں میں کہہ رہے تھے کہ

"میں ایک ایسے اندیشے کی گرفت میں ہوں جس کا کوئی نام نہیں بتا سکتا۔ مجھے اندیشہ یہ ہے کہ صورت حال اچھی نہیں۔ لیکن میں تمہارے دل کو اپنے غیر موثق شبہات سے میلا کرنا نہیں چاہتا"

ہریجن کی ایک سُرخی کے چار لفظوں میں اُنہوں نے اپنا دل کھول کر رکھ دیا تھا:-

"یہ بچہ جاں بلب ہے؟"

کانگریس کی مجلس عاملہ کے جلسوں کی روئیداد ایک بند کتاب

ہے اور مولانا کا کوئی سوانح نگار یہ نہیں بتا سکتا کہ اس تمام کشمکش کے دوران میں مولانا کس حد تک کسی تجویز کے مخالف یا موافق تھے۔ لیکن یہ تو ایک کھلا ہوا راز ہے اور کانگریس کے تمام لیڈر تسلیم کرتے ہیں کہ اس تمام گفت و شنید کے دوران میں مولانا نے اوّل بحیثیت صدر کانگریس اور بعد میں رکن عاملہ کی حیثیت سے اس گفتگو کی دشواریوں اور پیچیدگیوں سے عہدہ برآ ہونے میں جس اعلیٰ تدبر، تحمل اور توازن فہم کا ثبوت دیا وہ کانگریس کی پوری تاریخ میں اپنی آپ ہی مثال ہے۔ اس عارضی حکومت کا تخیل جو ویول نے بتائی مولانا کے لئے شروع سے آخر تک ناقابل قبول تھا۔ لیکن جس طرح مہاتما گاندھی بالکل اُسی طرح مولانا بھی بے پناہ حالات اور سب سے زیادہ برطانوی تدبر کی بے پناہ چالاکیوں کے جال کی مضبوط کڑیاں توڑ نہ سکے اور آزادی کی اُمید کا انحصار اب اسی شرط پر رہ گیا کہ لیگ کے مطالبہ کو تسلیم کر لیا جائے۔ مولانا صحافت اور نشریات کی دُنیا سے بہت دور رہنا پسند کرتے ہیں اس لئے یہ ممکن نہیں کہ اس زمانہ کے کوائف کی نسبت ہم مولانا کے صحیح تاثرات کا کھوج پا سکیں۔

جس وقت عارضی حکومت میں شرکت کا سوال زیر بحث تھا تو لیگ کا دعویٰ یہ تھا کہ وہ (تنہا) مسلمانوں کی نمایندہ ہے اس لئے کانگریس کو حق حاصل نہیں کہ وہ کسی مسلمان کو کابینہ کی رکنیت کے لئے اپنی طرف سے نامزد کرے۔ لیکن جب نامزدگی کا وقت آیا تو خود اُس نے اس اصول سے قطع نظر کر کے اقوام مندرجہ فہرست کے ایک غیر مسلم کو نامزد کیا

اور راجہ غضنفر علی خاں نے تو صاف کہدیا کہ "ہم انٹیریم گورنمنٹ میں صرف پاکستان کے لئے جنگ کرنے جا رہے ہیں" کچھ تعجب نہیں کہ خود ا برطانوی تدبر نے بھی یہی نقطہ نظر اختیار کیا ہو کہ اب انٹریم گورنمنٹ کی کابینہ کو پاکستان کے لئے جد وجہد کا میدان بنانا ہے اور دنیا کی رائے عامہ کو اس فریب میں مبتلا کر دینا ہے کہ ہندستان کی دو بڑی قومیں مل جلکر حکومت نہیں کر سکتیں۔ انگریزی تدبر کا یہ حربہ کامیاب ہوا اور یہ بات تو ماننی ہی پڑے گی کہ اس بساط پر کانگریس کی بازی ہر گئی۔

دستوری مباحث کی اس گرما گرمی کے دوران میں فرقہ واری فتنہ وفساد کا میدان بھی گرم ہو رہا تھا اور آخری دفعہ برطانوی تدبر کے قمار خانہ میں ملک کو آیندہ آزادی کی بہت بڑی قیمت ادا کرنی پڑی تھی۔ ۱۹۴۶ء میں بہار اور بنگال کی سرزمین وہاں کے مسلمان اور ہندو باشندوں کے خون سے رنگین ہو گئی۔ جبریہ تبدیل مذہب اور غیر مذہب کی عورتوں سے جبریہ شادی کے واقعات نے فرقہ واری فتنہ کے ڈنک کی نوک اور زہر کی تاثیر بہت تیز کر دی۔ مہاتما گاندہی تمام دستوری مباحث سے قطع نظر کر کے اس فتنہ کے رفع کرنے میں مصروف ہو گئے اور "یا کچھ کر دو یا مر جاؤ" کی جیکار اور "اکلا چلو" کے بھجن کو اپنا رہنما بنا کر وہ اپنے چند خاص ساتھیوں کو لیکر بنگال اور بہار کی آگ میں کود پڑے مہاتما جی کی زندگی کے اس کارنامے پر ہندستان کا آیندہ مورخ بہت کچھ لکھیگا اور انسانیت کی وہ مشعل جو اُنہوں نے بنگال اور بہار میں

روشن کی اس ملک کی تاریخ میں صدیوں تک روشن رہیگی۔
۱۹۴۷ء میں مہاتما جی کو کانگریس کے لیڈروں نے دہلی بلالیا، اُس وقت دستوری مباحث کا قافلہ ایک ایسی منزل تک پہونچ چکا تھا جہاں راستے تقسیم ہو رہے تھے، لیگ نے دستور ساز مجلس میں شریک ہونے سے اِنکار کردیا تھا اور مسٹر جناح سے مہاتما جی کی ملاقات بھی کوئی نتیجہ پیدا نہ کرسکی تھی۔ لہٰذا وہ دہلی میں ایک مختصر قیام کے بعد پھر بہار واپس چلے گئے۔ لیکن دہلی کی فضا اب اتنی زہرآلود ہوچکی تھی کہ خود مہاتما جی کی پرارتھنا میں ہندو اور سکھ شرکاء قرآن شریف کی آیتوں کے پڑھے جانے پر اعتراض کرنے لگے تھے اور ہندو مہاسبھا اور راشٹریہ سیوک سنگھ کے نیزے کی نوک اب کھُلے میدان میں چمکنے لگی تھی۔ لیکن پھر بھی مہاتما جی اپنے ملک کو مایوسی کی گہرائیوں میں گرنے سے روک رہے تھے۔ اُنہوں نے اس فتنہ پر تبصرہ کرتے ہوئے ہریجن میں لکھا کہ:-

"میں ایک ناقابل علاج "رجائی" ہوں۔ ہم نے اِن تمام طویل برسوں میں اس لئے محنت اور جدوجہد نہیں کی تھی کہ ہم ایسے وحشی بن جائیں جیسے کہ اب ہم ظاہر ہوتے ہیں جبکہ ہم بنگال، بہار اور پنجاب کی دیوانگی اور خونریزی کو دیکھتے ہیں۔ لیکن میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ یہ صرف ایک علامت ہے اس بات کی کہ ہم

غیر ملکی جُوا اپنے کاندھوں سے اُتار کر پھینک رہے ہیں اور اندر کی تمام غلاظت اور خاک دُھول سطح پر نکلی آرہی ہے۔ جب گنگا میں سیلاب آتا ہے تو پانی گدلا ہو جاتا ہے، مٹی سطح پر آجاتی ہے مگر جب سیلاب ختم ہوتا ہے تو پھر تم صاف نیلا پانی دیکھتے ہو جس سے آنکھوں میں خنکی پیدا ہوتی ہے۔ اسی کی میں تمنا رکھتا ہوں اور اسی دن کے لئے میں زندہ رہنا چاہتا ہوں۔ میں نہیں چاہتا کہ ہندستان کی انسانیت کو وحشت میں تبدیل ہوتے اپنی آنکھوں سے دیکھوں۔

(ہریجن - ۸ر جون ۴۷ء)

لیکن **مہاتما جی** نے وہ سب کچھ دیکھا جو وہ نہیں دیکھنا چاہتے تھے تاہم وہ انسانیت کی ایک لازوال وراثت اپنے ملک کے لئے چھوڑ گئے جس کی حفاظت اب ایک مجبور و مجروح مگر آزاد ہندستان کو کرنی ہے۔

۱۷

۳ر جون ۴۷ء کو تقسیم اور آزادی کا اعلان ہوا۔ کانگریس کی مجلس عاملہ

نے اپنے اعلان میں تقسیم پر اپنی رضامندی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ کانگریس اسلحہ کی قوت سے نہیں دبی بلکہ صرف حالات کی قوت سے دب گئی ہے۔ مہاتما گاندھی نے ان لوگوں کو جواب دیتے ہوئے جو لارڈ مونٹ بیٹن پر الزام رکھ رہے تھے لکھا کہ اس فیصلہ میں قصور ویسرائے کا نہ تھا۔ بلکہ یہ فیصلہ کانگریس اور لیگ نے مشترکہ طور پر کیا ہے اور ویسرائے مجبور تھے کہ اس فیصلہ کو قبول کرلیں۔ یہ کوئی راز نہیں ہے کہ مہاتما گاندھی خود اس فیصلہ کو ناپسند کرتے تھے۔ لیکن وہ بھی اُسے قبول کرنے پر اُسی طرح مجبور ہوئے جس طرح کہ اُن کی رائے میں لارڈ مونٹ بیٹن۔

۱۵ اگست کو ہندستان کی آزادی کا اعلان ہوا اور اُسی کے چند روز بعد بنگال اور پنجاب کی تقسیم کا اعلان ہوگیا۔ یہ اعلان ایک چنگاری تھی جو پنجاب کے باروت خانہ میں گری اور اس کے بعد دنیا نے انسانوں کی بہیمیت اور وحشت کے جو مناظر پنجاب اور دہلی میں دیکھے وہ انسانیت کے دامن پر ایک ایسا دھبہ ہے جو صدیوں تک باقی رہے گا۔ ان دو مہینوں کی تاریخ اُن وحشیانہ افعال کے لحاظ سے جن کا ارتکاب کیا گیا انقلاب فرانس کے Reign of Terror کی تاریخ ہے بلکہ اُس سے بھی بدتر۔

ہندستان کی تہذیب پر سب سے زیادہ شرمناک دھبہ وہ مظالم ہیں جو عورتوں اور بچوں پر کئے گئے۔ اور اس فرقہ پرستی کے ہولناک فتنہ کا آخری شعلہ وہ تھا جس نے خود مہاتما جی کے رخت حیات کو ایک

آن واحد میں پھونک دیا، لیکن یہ کہنا مبالغہ نہیں ہے کہ مہاتما جی کے خون کے ایک ہی چھینٹے نے اُن انسانیت سوز آگ کے شعلوں کو اس طرح ٹھنڈا کر دیا جسطرح کہ کوئی دوسری چیز نہ کر سکتی تھی۔ یکم ستمبر کو کلکتہ میں اور پھر جنوری ۱۹۴۸ء میں دہلی میں مہاتما جی نے آخری مرتبہ فرقہ داری مسلم اتحاد کے لئے برت رکھا اور ۳۰؍جنوری کو بالآخر اپنے مقصد کی آخری اور انتہائی قیمت ادا کرکے وہ انسانیت کے اعلیٰ ترین فرض سے سبکدوش ہو گئے۔

۱۹۴۷ء کے آخری اور ۱۹۴۸ء کے ابتدائی مہینے **مولانا** جیسے حساس انسان کے لئے زندگی کے سخت ترین امتحان کا زمانہ تھا۔ مرکزی حکومت کے رکن کی حیثیت سے بھی اور کانگریس کے ایک بڑے لیڈر کی حیثیت سے بھی اُن کو اس آگ میں گذرنا پڑا۔ اہل دہلی جو بہت قریب سے **مولانا** کو دیکھ رہے تھے اس حقیقت پر گواہ ہیں کہ اس ہولناک دور میں **مولانا** کی انسانیت کس طرح اس امتحان میں پوری اُتری۔ وہ دن اور رات حالات کا مقابلہ کرنے میں مصروف رہے اور امن و اماں کے لئے اُن کی جد و جہد کا کوئی گوشہ ایسا نہ تھا جسمیں **مولانا** کی شخصیت کے بہترین قوی برسر کار نہ آئے ہوں، دیکھنے والوں نے دیکھا کہ دہلی کے اس دور میں وہ اپنے سخت سے سخت مخالفین اور دشمنوں کی بھی پوری پوری مدد کر رہے تھے۔ اُن کا مکان ہر شخص کے لئے پناہ گاہ تھا۔ اُن کے دنوں اور اُن کی راتوں کا ہر لمحہ مصیبت زدوں اور مظلوموں کی خدمت اور امداد کیلئے

وقف تھا۔ اس زمانہ میں وہ مہاتما جی کے دست راست تھے اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اُس ہنگامہ کی مایوس کن تاریکی میں وہ اور مہاتما جی ایک دوسرے کا سہارا تھے۔ مہاتما جی کا دفعتاً دنیا سے رخصت ہو جانا بلاشبہ مولانا کی زندگی کا سب سے بڑا المیہ ہے، لیکن اُن کی باوقار شخصیت کو باہر سے دیکھنے والے لوگ اس بات کا صحیح اندازہ نہیں کر سکتے کہ سنجیدگی اور تمکین کی اس خاموش سطح کے نیچے مولانا کی زندگی میں یہ کتنا گہرا زخم ہے جو ہمیشہ رِستا رہیگا۔

مولانا اور گاندھی جی کی زندگی کے دھارے جس طرح پہلو بہ پہلو بہتے رہے اُن کا "مطالعہ" ایک بڑی کتاب کے سینکڑوں صفحات چاہتا ہے۔ لیکن اتنی بات تو چند سطروں میں اِن اوراق پر بھی کہی جاسکتی ہے کہ مولانا کے سیاسی مخالفین کا یہ پروپیگنڈا کہ مولانا گاندھی جی کے اس درجہ زیر اثر تھے کہ جو کچھ گاندھی جی چاہتے تھے وہی وہ کہتے تھے کینہ پرور اور شرارت آمیز دروغ بیانی کے سوا کچھ نہ تھا۔ کانگرلیس کی روئیدادوں میں مولانا اور مہاتما جی کے درمیان اختلاف رائے کی متعدد مثالیں موجود ہیں۔ خود عدم تشدد کے اصول کے متعلق جو مولانا کے سیاسی عقیدہ کا بھی ایک اہم جزو تھا اُنہوں نے مہاتما جی کے مقابلہ میں کانگریسی عاملہ کی رائے کا ساتھ دیا۔ اسی طرح آخری زمانہ میں مذہبی تعلیم کے مسئلہ پر جب مولانا نے بحیثیت وزیر تعلیم اپنے خیالات ظاہر کئے اور اس امر پر زور دیا کہ حکومت کو مذہبی تعلیم

بھی انتظام کرنا چاہیئے تو مہاتما جی نے مولانا کے زاویہ نظر سے علانیہ اختلاف کیا۔ مولانا شروع ہی سے مرکزی حکومت کی رُکنیت میں شریک ہونا اپنے لئے ناپسند فرماتے تھے اور اگر مہاتما گاندھی کے اصرار نے اُنہیں مجبور نہ کر دیا ہوتا تو اس میں شبہ نہیں کہ مولانا کے ذہنی سانچہ میں اس قسم کے کسی عہدے کے لئے کوئی گنجائش موجود نہ تھی۔ پھر جب وہ یہ عہدہ قبول فرما چکے تو دستوری مباحث اور پھر فرقہ داری فسادات کا ایک ایسا سلسلہ شروع ہوا جس نے مولانا کی دفتری زندگی کے مشاغل کو بہت کچھ متاثر کیا۔ پھر بھی بحیثیت وزیر تعلیم مولانا نے اپنے بعض انقلاب انگیز نظریات کو اپنے محکمہ کا راہ نما بنایا اور جب ضرورت ہوئی تو جرات کے ساتھ عام رائے یا اپنے شرکائے کار کی رائے سے اختلاف ظاہر کیا۔ انگریزی تعلیم کو ذریعہ تعلیم بنانے کے متعلق مولانا نے اس رائے سے اختلاف کیا کہ انگریزی زبان فوراً ترک کر دی جائے، اسی طرح مذہبی تعلیم کے متعلق اپنا وہ نظریہ پیش کیا جس سے خود مہاتما جی بھی متفق نہ تھے! انھوں نے ہندستان اسٹینڈرڈ کے ایک نمائندے سے فرمایا کہ:-

"ہندستان میں دوسرے ممالک سے زیادہ مذہب پر زور دیا جاتا ہے۔ نہ صرف گذشتہ روایات بلکہ لوگوں کا موجودہ مزاج بھی مذہبی تعلیم کی اہمیت میں اضافہ کرنے کا رجحان رکھتا ہے۔ اگر حکومت

یہ فیصلہ کرے کہ مذہبی تعلیم بھی تعلیم عامہ میں شامل کی جائے تو یہ امر ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مذہبی تعلیم جو دی جائے وہ بہترین قسم کی ہو۔ ہندستان کے پرائیویٹ اداروں میں جو مذہبی تعلیم دی جاتی ہے وہ اکثر ایسی ہوتی ہے کہ نظر کو وسیع کرنے اور روا داری کی روح پیدا کرنے کے بجائے اُس کے خلاف نتائج پیدا کرتی ہے۔ قرین قیاس یہ ہے کہ حکومت کی نگرانی میں بہ نسبت فرقہ واری اداروں کے فرقہ واری تعلیم بھی زیادہ وسیع النظری کے تحت دی جاسکے گی۔ مذہبی تعلیم کا مقصد یہ ہونا چاہیئے کہ انسان زیادہ روادار اور وسیع الخیال بنیں اور میری رائے یہ ہے کہ یہ کام زیادہ موثر طریقے سے کیا جاسکتا ہے۔ اگر حکومت تعلیم کا انتظام اپنے ذمہ لے بجائے اس کے کہ وہ پرائیویٹ طریقوں پر منحصر رہے۔"

مذہبی تعلیم کے متعلق حکومت کی آئندہ پالیسی کیا ہوگی یہ تو ایک الگ سوال ہے، لیکن مولانا کے بنیادی مقصد کو سمجھنا مشکل نہیں۔ وہ وہی ہے جو مولانا کی زندگی کا مقصد ہے۔ یعنی فرقہ واری اتحاد۔ وہ جانتے ہیں کہ فرقہ واری اداروں میں جو مذہبی تعلیم دی جاتی ہے

اور دی جائے گی وہ فرقہ پرستی کے زہریلے اثرات سے یقیناً متاثر ہوگی اس لئے وہ مذہبی اور اخلاقی تعلیم کے لئے ایک سرکاری معیار قائم کرنا چاہتے ہیں اور غالباً یہ چاہتے ہیں کہ اُن زہریلے پودوں کو پنپنے نہ دیں جو فرقہ واری اداروں میں پرورش پاتے ہیں۔

۱۸

مذہب کے معاملہ میں مولانا کے نقطہ نظر کو سمجھنے کیلئے الہلال اور ترجمان القرآن کا گہرا مطالعہ ضروری ہے اسکے بعد مولانا کے بعض خطبات سے بھی اس معاملہ میں اُن کی اجتہادی قوت ظاہر ہوتی ہے۔ مولانا کی راہ اس قدیم مسلک سے جدا رہی جو اُن کے زمانہ میں اور اُن سے پہلے قدیم علماء کا تھا۔ "نقش ثانی"۔ میں مولانا کے فکر و نظر کے اس مجتہدانہ پہلو کی طرف چند واضح اشارے کئے گئے ہیں۔ مذہب کے متعلق مولانا کے افکار کی وسعت اور ہمہ گیری کچھ ایسی ہے کہ تمام مذاہب عالم کے بہترین عناصر اُس کے اندر سما جاتے ہیں۔ فروری سنہ ۲۰ء میں مجلس خلافت بنگال کو مخاطب فرماتے ہوئے مولانا نے فرمایا تھا کہ:۔

"دنیا کے تمام تر نزاعات اور اختلافات کی ایک

سب سے بڑی علت حقیقت کی وحدت اور اسماء و مصطلحات کی کثرت ہے۔ طلب صداقت کے اکثر جھگڑے حکایت شہد و عسل سے زیادہ نہیں۔ یعنی سچائی ہر جگہ اور ہر گوشہ عمل میں حقیقت اور مسمیٰ کے اعتبار سے ایک ہی ہے، لیکن بھیس مختلف ہو گئے ہیں۔ مصیبت یہ ہے کہ دُنیا معانی کی جگہ لفظوں کی پرستش کرتی ہے۔ اور گو سب طلبگار و پرستار ایک ہی حقیقت کے ہیں لیکن محض ناموں کے اختلاف کی وجہ سے باہم دیگر لڑ رہے ہیں۔ ایک کہتا ہے شہد، دوسرا کہتا ہے عسل۔ مگر کوئی نہیں جو دونوں کو سمجھا دے کہ مقصود دونوں کا ایک ہی ہے .... مذاہب کے اختلاف سے لیکر معاشرت و رسوم کے چھوٹے چھوٹے اختلاف تک ہر جگہ یہی علت کام کر رہی ہے اگر کبھی ہو سکے کہ ظواہر و اسماء کے تمام پردے اُٹھا دیئے جائیں اور حقیقت بے نقاب ہو کر سامنے آجائے تو یکایک دنیا کے تمام نزاعات ختم ہو جائیں اور تمام لڑنے والے دیکھ لیں کہ سب کا مطلوب ایک ہی ہے اگرچہ بھیس مختلف ہیں اور سب کا مقصود ایک ہی ہے اگرچہ نام بہت ہیں........"

الہلال میں ایک مستفسر کے سوال کا جواب دیتے ہوئے مولانا نے اپنے نقطہ نظر کی مزید وضاحت اس طرح فرمائی ہے کہ:-

"مذہب اور پیروان مذہب کا امتیاز ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہیئے۔ یہ دو مختلف چیزیں ہیں۔ ایک چیز نہیں ہے۔ مذہب کے بارے میں ہماری دو تہائی مایوسیاں اسی غلطی کا نتیجہ ہوتی ہیں کہ ہم بسا اوقات ان دونوں کا عددی اختلاف بھول جاتے ہیں.... دنیا کی کوئی تعلیمی صداقت بھی ایسی نہیں ہے جس کے پیرووں کے فہم و عمل کو حجت قرار دیکر ہم حقیقت کی طرف قدم بڑھا سکتے ہوں........ سچائی کی راہ ایک سے زیادہ نہیں ہو سکتی۔ اس لئے قرآن کے لئے بظاہر دو ہی طریقے ہو سکتے تھے یا تو وہ تمام پیروان مذاہب کی تصدیق کرے یا سب کی تکذیب کرے۔ سب کی تصدیق کی نہیں جا سکتی تھی کیونکہ ہر ایک کا دعویٰ دوسرے سے متضاد تھا .... اس طرح سب کی تکذیب بھی صداقت کے خلاف تھی کیونکہ اس صورت میں دنیا کا مذہبی صداقت سے خالی ہونا لازم آتا تھا۔ اور انسان کی روحانی و تربیت کی تمام بنیادیں منہدم ہو جاتی

تھیں۔ پس اُس نے دونوں طریقوں میں سے کوئی طریقہ بھی اختیار نہیں کیا۔ ایک تیسری راہ اختیار کی۔ اُس نے کہا۔ دنیا کے تمام مذاہب حق ہیں لیکن دنیا کے پیروان مذاہب حق سے منحرف ہو گئے ہیں۔ جسقدر بھی گمراہی ہے، جس قدر بھی اختلاف ہے، جس قدر بھی دعوؤں کی لڑائی اور جماعت بندیوں کا تصادم ہے پیروان مذہب کے فہم و عمل میں ہے مذہب کی تعلیم میں نہیں ہے۔ اگر پیروان مذہب کا یہ انحراف دور ہو جائے جو حق نہیں ہے تو ہر جماعت کے پاس وہ چیز باقی رہ جائے گی جو حق ہے........ یہی مذاہب عالم کا "مشترک حق" دنیا کی عالمگیر روحانی صداقت ہے۔"

مولانا نے جس نظر سے تعلیمات قرآنی کو دیکھا اور سمجھا اور جس طرح قدیم مفسرین اور فن تفسیر پر تنقید کی اُس کا ان صفحات میں مختصراً صرف اتنا ہی ذکر کیا جاتا ہے جتنا کہ اُس " عالمگیر حق" کے متعلق مولانا کے وسعت فہم کی طرف اشارہ کرنے کے لئے کافی ہو جس کو وہ تمام مذاہب عالم کا صحیح مفہوم قرار دیتے ہیں۔ الہلال میں ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے مولانا نے لکھا کہ:۔

" قرآن کریم کے مطالعہ تدبر میں آپ کو جو مشکلات

پیش آرہی ہیں وہ اُس وقت تک پیش آتی رہیں گی جب تک کہ اس بارے میں چند بنیادی اصول واضح نہ ہوجائینگے ...... مختصراً یوں سمجھیئے کہ صدرِ اوّل کے بعد سے قرآن کریم کے فہم و تدبر کی راہیں دو ہوگئیں۔ ایک قرآنی ہے دوسری غیر قرآنی .... غیر قرآنی طریقہ سے مقصود وہ تمام طریقے ہیں جو قرآن سے نہیں بلکہ مفسرین قرآن کے ذوق و فکر سے پیدا ہوئے یہ علوم وضعیہ کی اشاعت ایرانی، رومی اور ہندی تمدن کے اقتباس اور عجمی اقوام کے اختلاط کا قدرتی نتیجہ تھا۔ مفسرین کے ہر گروہ نے قرآن کے مطالب اسی شکل و نوعیت میں دیکھے جیسی شکل و نوعیت کی فکری حالت اُن کے اندر پیدا ہوگئی تھی رفتہ رفتہ یہ حالت ہوگئی کہ قرآن کے الفاظ تراکیب، اسلوب بیاں، دلائل و براہین مواعظ و حکم سب نے ایک دوسری ہی طرح کی نوعیت اختیار کرلی۔ قرآن کی تعلیم و بیان کی تمام تر بنیاد فطرت اور فطرت کی سادگی پر تھی، علوم و فنون کی تمام تر بنیاد وضعیت اور وضعیت کے تعلق اور کاوش پر ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ جوں جوں وضعیت کا انہاک بڑھتا گیا

فطرت کے ذوق و فہم کی استعداد کم ہوتی گئی، یہاں تک
کہ وہ زمانہ آگیا جب لوگوں کے دماغ اسدرجہ وضیعت
اور وضعی طریق بحث کے عادی ہوگئے کہ کسی اہم اور عظیم
بات کو اس کی سادہ اور سہل صورت میں دیکھ ہی نہیں
سکتے تھے .... مقدمات کے طریقہ کا
تمامتر دار و مدار وضعی علوم کے فطری مسلمات پر ہوتا ہے
اور یہ مسلمات نہ تو ہر حال میں حقیقی ہیں نہ ہر زمانہ کی علمی
استعداد یکساں طور پر اُن کا اعتراف کر سکتی ہے۔ بہت
ممکن ہے کہ کل تک جو بات مسلم طور پر مانی جاتی تھی آج
اتنی کمزور ہو جائے کہ لوگ اُس کی ہنسی اڑائیں۔ ایمان
کی بنیاد ایسی متغیر اور متلون بنیاد پر نہیں ہو سکتی"

مفسرین و متکلمین کے منطقی طریقہ استدلال اور بال کی کھال نکالنے کے انداز سے مولانا نے بار بار اپنی بیزاری کا اظہار کیا ہے اور قدما کی اس راہ سے جسے وہ حقیقت سے بہت دور سمجھتے ہیں۔ مولانا قطعاً روگردان ہوگئے۔ اُنہوں نے نام لے کر قدیم مفسرین اور اُنکے مقلدین پر تنقید فرمائی ہے! اور اپنا راستہ اُن سب سے جدا بنایا ہے۔

اس بحث کے سلسلہ میں ایک موقعہ پر فرماتے ہیں کہ:۔

" افسوس قرآن کہاں لے جانا چاہتا تھا اور دنیا
نے اُسے سر پر رکھ کر کدھر کا رُخ کیا۔ ہمارے مفسرین

متکلمین ارسطو کی منطق اور یونانیوں کی دانش فروشیوں میں ایسے گم ہوگئے کہ اُنہیں دوسری راہوں کی خبر ہی نہ رہی "۔

اس امر میں کوئی شبہ نہیں کہ اگر مولانا کو اُن کے سیاسی اشغال نے کچھ بھی فرصت دی ہوتی تو آج اُن کے فہم و فکر سے مذہبی حقائق کے قریب تر اتصال کی راہیں پیدا ہوتیں اور مذہب کے نام پر دنیا میں جو فتنہ برپا ہوتا ہے اس کے استیصال کی وہ موثر تدبیریں بتا دیتے اور انسانیت کے مصلح اور داعی کی حیثیت سے مولانا کا نام شاید اس سے بھی زیادہ روشن ہوتا جتنا کہ ایک سیاسی لیڈر کی حیثیت سے ہے ۔ لیکن ہر اولوالعزم انسان کی زندگی میں بہت ایسے موڑ آتے ہیں جب زندگی کی ایک رو اُن کا راستہ بدل دیتی ہے اور کتنا ہی کسی سمت میں جانا نہ چاہیں لیکن اُسی سمت میں بڑھ جاتے ہیں گویا کوئی تقدیر ہے، نامعلوم اور مخفی، جو انہیں ایک میدان عمل سے دوسرے میدان میں کھینچ کر لے جاتی ہے ۔ مولانا نے اپنی فطرت پر حالات کے جبر کا بارہا شکوہ کیا ہے ۔ دسمبر ۲۰ء میں خلافت کانفرنس کو مخاطب کرتے ہوئے اُنہوں نے فرمایا تھا کہ

" میں کئی سال سے اس کوشش میں ہوں کہ صرف اپنی قلمی مشغولیت ہی کے لئے وقف ہو جاؤں ۔ میری طبیعت کا یہ میلان محض میرے ذوق طلب ہی کا تقاضا نہیں بلکہ میرا یقین ہے کہ میرے لئے وقت کی تمام

قومی خدمات میں یہی خدمت سب سے زیادہ ضروری اور اہم ہے۔ گذشتہ پانچ سال کے اندر میں نے بار بار کوشش کی کہ قومی مجالس کی سرگرمیوں کے ساتھ یہ کام بھی جاری رکھوں۔ لیکن تجربے سے معلوم ہوگیا کہ وہ بغیر یکسوئی کے ممکن نہیں۔ بالآخر مجبور ہو کر یہ فیصلہ کرنا پڑا کہ اِن سرگرمیوں سے بالفعل کنارہ کش ہو جانا چاہیئے۔ اور اگر ان میں حصہ بھی لینا پڑے تو صرف اُسی حد تک جہاں تک میری قلمی مصروفیت کا ضروری انہماک اجازت دے۔ اس حالت کا یہ قدرتی نتیجہ تھا مجھے اس نئی ذمہ داری کی قبولیت میں تامل ہوتا۔ تامل ہوا۔ لیکن بالآخر جب میں نے گرد و پیش پر نظر ڈالی تو اس کے سوا چارہ نظر نہ آیا کہ اپنے فیصلہ پر وقت کے تقاضے کو ترجیح دوں اور تسلیم کرلوں کہ ہم خدمتگذارانِ قوم کے لئے اصلی فیصلہ وہی ہے جو وقت کا فیصلہ ہو۔ ہمیں پسند و اختیار کی بہت سی چیزوں کی طرح اپنے فیصلہ کے حق ترجیح سے بھی دستبردار ہوجانا چاہیئے ...."

اس طرح ہم نے اخلاق و انسانیت (جس سے عبارت مذہب ہے) کا ایک مصلح اعظم کھویا اُسکے بجائے ایک سیاسی لیڈر اور قائد اور اپنے آزاد ملک کی

حکومت کا ایک بالغ نظر رکن اور مدبر پایا۔ اب کون یہ حساب لگائے کہ جبرو اختیار کے اس سودے میں ہندستان اور ہندستان کے مسلمانوں کو خسارہ زیادہ ہوا یا فائدہ! جو کھویا وہ زیادہ ہے یا جو پایا وہ زیادہ ہے! یہ فیصلہ آئندہ مورخ کے لئے چھوڑ دیجیے!

نقشِ ثانی

"قبل اس کے کہ ہم پر شہادت دی جائے بہتر ہے کہ ہم خود آپ ہی اپنے لئے شاہد بن جائیں!"

"صداقت اپنے حامیوں کی کثرت و قلت اور استقامت و تزلزل سے ہمیشہ بے پرواہ رہی ہے اور ہمیشہ رہیگی . . . . سچ کی کسوٹی اُسکے حامیوں کی کثرت نہیں ہے۔ اُس کے لئے تو اتنا ہی کافی ہے کہ وہ سچ ہے!"

"یہاں پانے کا مزا اُن ہی کو مل سکتا ہے جو کھونا جانتے ہیں"

(مولانا ابوالکلام آزاد)

---

*

"نقاش" "نقشِ ثانی" بہتر کشد ز اول" مولانا کے سوانح نگار پر اس قدر صادق نہیں آتا جس قدر کہ خود مولانا کی زندگی پر۔ اُن کی زندگی کا یہ پہلو جو "نقشِ ثانی" میں پیش کیا جاتا ہے، سیاسی زندگی کے گرد و غبار سے بالکل پاک ہے اور اسی لئے زیادہ دلنواز ہے۔ اس "نقشِ ثانی" میں ہم اُنہیں صرف ایک مفکر، ادیب اور فطرت کے اعلیٰ اور لطیف احساسات کے نقیب و ترجمان کی حیثیت سے دیکھتے ہیں اور اُن کی فطرت عالیہ کے متعلق اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ اگر وہ اتنے بڑے انشاء پرداز اور ادیب نہ ہوتے تو بہت بڑے مصوّر ہوتے یا مغنی ہوتے یا شاعر ہوتے! اُن کی رومانیت کو اگر ایک طرف

مذہب کے تقدس اور دوسری طرف سیاست کی سنجیدگی نے پابند نہ کرلیا ہوتا تو ہم اپنے ملک میں ایک شوپنہار، ایک نیٹشے یا ایک عمر خیام کے تصورات اُن کے قلم سے پیدا ہوتے دیکھتے اور اُن کے قلم کا یہ آبشار جو ہندستان کے نشاۃ الثانیہ کا نقیب ہوا ہمیں وجدانیات اور رومانس کی پر فضا وادیوں میں بہالے جاتا۔

اگر مولانا فرشتہ ہوتے تو اُن کی سوانح حیات بہت ہی مختصر ہوتی۔ دو لفظوں میں میں اُسے ختم کردیتا! لیکن وہ انسان ہیں اور انسان کے تمام کمالات اور اکثر کمزوریوں کو ساتھ لائے ہیں اُنکی بے پناہ "انفرادیت" میں اُن کی انسانی کمزوریاں بھی اُن کا کمال بن گئی ہیں۔ اُن کی بڑائی یہ بھی ہے کہ وہ اپنی بڑائی کا احساس رکھتے ہیں۔ بغیر ادنیٰ قسم کے پندارِ انسانی اور خود بینی کے! کسی دوسرے کمتر انسان میں یہ احساس ایک عیب سمجھا جاتا، مگر اُن کے فکر و نظر کی وسعتوں میں وہی اُن کی قوت ہے

جب اپنی زندگی کے راستے میں وہ دنیا اور انسانی فطرت کی مکروہات سے ٹکراتے ہیں تو بڑائی کا یہی احساس ہے جو انہیں تمام تلخکامیوں کا مقابلہ کرنے کی قوت بخشتا ہے۔ اور وہ روسو کی زبان سے کہہ سکتے ہیں کہ

"دنیا میں ہر شخص کا ایک کام ہوتا ہے، بڑا کام یہی ہے کہ میں تلخ مگر مفید سچائی کو عوام پر ظاہر کردوں۔

جہاں تک میری استطاعت میں تھا۔ میں نے انسانیت شرافت اور رواداری کی دعوت دی ہے۔ اگر دُنیا نے نہیں سُنا تو یہ میرا قصور نہیں ہے۔ میں نے تو اپنے لئے ایک قاعدہ بنالیا ہے کہ میں عالمگیر سچائیوں کا ساتھ دوں گا۔

مولانا کی نفسیات اُن کے ادب کے آئینہ میں

(۱)

یہ تبصرہ اپنی ایک غلط اندیشی کے اعتراف سے شروع کرتا ہوں۔

کم و بیش تیس سال ہوئے جب میں پہلی دفعہ مولانا کی شخصیت سے آشنا ہوا تھا۔ وہ زمانہ میری ذہنی تربیت کا زمانہ تھا۔ میں نے سب سے پہلے مولانا کو ایک ادیب اور خطیب کی حیثیت سے جانا تھا۔ اُن کے سیاسی مسلک اور فلسفہ حیات کو تو میں بعد میں سمجھا۔ الہلال اور البلاغ کے دور میں میں نے مولانا کے سیاسی افکار سے زیادہ

اُن کے ادب سے، بحد استعداد، فکر و نظر کی روشنی حاصل کی۔ مجھے یاد ہے کہ جب **الہلال** اور **البلاغ** کے صفحات پر میں مولانا کے جدت طراز قلم کی سحر کاری دیکھتا تھا تو اپنی نارسائی کا ایک عجیب احساس میرے اندر پیدا ہوا کرتا تھا۔ میں سوچا کرتا تھا کہ جب حالت یہ ہے کہ

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اُس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

تو پھر یہ کیا بات ہے کہ میرا قلم اپنے تصورات کو اُسی انداز سے ادا کرنے پر قادر نہیں ہوتا۔ اُس زمانہ میں بہت سے اہلِ قلم ایسے پیدا ہو گئے تھے جو مولانا کے اندازِ نگارش کا عکس چرایا کرتے تھے۔ میں نے الفاظ کی چوری تو کبھی نہیں کی لیکن اکثر اُن تصورات کو اپنایا جو مولانا کے قلم کے آبشار سے چھلکا کرتے تھے۔

یہ زمانہ مولانا کے ادب و خطابت کے شباب کا زمانہ تھا اور اُن کے اندازِ بیاں اور طرزِ تکلم کی پختگی اور ہمہ گیری نے وہ اثر پیدا کر لیا تھا جو کم کسی ادیب کے قلم کو نصیب ہوا کرتا ہے۔ لیکن میں اُس وقت تک کاغذ و قلم کی رسم و راہ میں نو آموز ہی تھا

— "مکتبِ غمِ دل" میں میرے سبق محض ابتدائی سبق تھے!

پھر جب مولانا کے جذبۂ بے اختیار نے اُن کی فطرت سے جھگڑا کر کے اپنی کشتی سیاسی طوفانوں میں ڈال دی تو مولانا کی مسلسل نظر بندیوں اور گرفتاریوں نے اُنہیں قلم اور کاغذ کی بساط سے ہٹا کر

ایک ایسے خارزار میں پہنچا دیا جہاں معاملہ دار ورسن کا درپیش تھا۔ اُنکے علم وفضل کے دائرے میں تو میری دسترس کچھ بھی نہ تھی، لیکن اُردو ادب کی جو محفل مولانا نے آراستہ کی تھی اُس کے ایک گوشہ میں کوئی مقام حاصل کرنے کی آرزو، میرے دل کے ایک گوشہ میں بھی خلوت نشین تھی۔ لیکن سیاسی دار وگیر کے اُن ہنگاموں میں وہ ساری محفل درہم وبرہم ہوگئی اور کچھ اس طرح درہم وبرہم ہوگئی کہ ادب کا وہ صاحب کمال آرٹسٹ اپنی سیاسی قیادت کی ناموری اور شہرت میں گم ہوگیا!

اب جو کم وبیش ۲۵ سال کے بعد میں نے سنا کہ مولانا کے بعض مکتوبات ایک کتاب کی شکل میں شائع ہو رہے ہیں تو گمان یہ ہوا کہ سیاسی زندگی کے اس طویل اور طوفانی ہنگامہ میں مولانا کے ذوق نگارش پر گرد وغبار کی نہ معلوم کتنی تہیں جم گئی ہوں گی۔ لیکن غبار خاطر کے چند صفحات پڑھنے کے بعد معلوم ہوا کہ

خود غلط بود انچہ ما پنداشتیم

جس ساز کے تاروں کو میں نے سمجھا تھا کہ ٹوٹ گئے ہوں گے اُن کی آہنگ کو تو میں نے کچھ اور زیادہ دلنواز پایا، اُن کے اندر زندگی اسی طرح بولتی ہوئی پائی اور وجدانِ لطیف اسی طرح کارفرما پایا جس طرح کہ ۲۵ سال پہلے وہ قلم کو نغمہ اور کاغذ کو رنگ عطا کرتا تھا۔ دنیائے ادب کی تاریخ میں ایسی مثالیں کم ملتی ہیں کہ ان نازک اور باریک

تاروں کی موسیقی میدان سیاست کی مزبوں کا مقابلہ کرلے۔ غبار خاطر نے میرے اندیشوں کو جھٹلا دیا اور مجھے یقین ہوگیا کہ ادب کی وہ رنگین روح جس نے الہلال اور البلاغ اور تذکرہ کے صفحات پر اس " دلفریبی انداز نقش پا " میں ارباب نظر کے لئے گوش و نظر کی ایک جنت آباد کی تھی اب بھی اپنی شعریت سے یک ذرہ محروم نہیں اور افکار سیاسی کا غبار اُس ذوق نگارش کے کسی گوشہ کو چھو بھی نہیں سکا۔

اپنی غلط اندیشی کے اس اعتراف کے ساتھ ہی اپنی اس جسارت کا بھی ذکر کردوں کہ میں غبار خاطر اور مولانا کی دوسری تصانیف پر کچھ ایسے زاویہ سے تبصرہ کرنا چاہتا ہوں کہ مولانا ہی کے قلم کے نقوش سے اُن کی معنوی زندگی بھی واضح ہو جائے۔ علمی اور ادبی تنقید و تبصرہ کے اصولوں پر ہندستانی زبان میں تو کم مگر دوسری زبانوں میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ ہندستانی ادب میں درحقیقت نقد و نظر کا فن ابھی اپنی ابتدائی منزلوں سے بھی نہیں گزرا ہے اور اس فن کے جن گوشوں کی طرف میں اشارہ کرنا چاہتا ہوں وہ تو ابھی اکثر اہل قلم کی حد نظر سے بھی باہر ہیں۔

کہنا مجھے یہ ہے کہ ادبی اور معیاری کتابوں پر تبصرہ کرتے وقت دو امور پر توجہ کرنا ضروری ہے، اور وہی دونوں نقادوں کی نظر سے اکثر دور رہ جاتے ہیں۔ اوّل تو ہم اُس تحریر کے آئینہ میں جو مصنف

پیش کرتا ہے خود اُس کی فطرت اور اُس کے شخصی تاثرات [illegible]
تلاش نہیں کرتے حالانکہ اہل قلم کی معنوی زندگی سے واقف ہونے کے لئے خود اُن ہی کی تحریروں کے پردوں کو ہٹانا ضروری ہے۔
دوسرے یہ کہ کسی کتاب پر تبصرہ کرتے وقت اُس کے مصنف کی نفسیاتی زندگی کو بطور ایک پس منظر کے پیش نہیں کیا جاتا۔ ہم تحریر اور اُس کے مفہوم کی ترجمانی تو کرتے ہیں، لیکن اسی کے پیچھے فکر و نظر کی جو روح یا ڈھکے ہوئے جذبات کی جو قوت کارفرما ہوتی ہے اُس سے ناآشنا رہتے ہیں اور اس طرح وہ ترجمانی ناقص رہ جاتی ہے۔ ہم یہ تو بتا دیتے ہیں کہ اہل قلم نے کیا لکھا اور کیا کہا لیکن یہ نہیں بتا سکتے کہ کیوں لکھا اور کیوں کہا۔ اُس کے ادب میں ادیب کی نفسیاتی زندگی کا عکس تلاش کئے بغیر لکھے ہوئے اوراق پر تبصرہ کرنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہم گویا ایک انسان کے جسم کی تصویر تو کھینچ لیتے ہیں لیکن اُس کے دل و دماغ کی حقیقت سے ناواقف رہتے ہیں۔ ہم جسم و لباس کی داستان آرائی میں اُس روح کے کسی گوشے تک نہیں پہنچتے جو ادیب کے قلم کو زندگی بخشتی ہے۔ ادیب اور اُس کا ادب فن تنقید میں دو جداگانہ عناصر نہیں ہو سکتے کہ ان میں سے کسی ایک کا تجزیہ جداگانہ کیا جا سکے۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے اس قدر لپٹے ہوئے ہیں کہ کسی ایک کے بغیر دوسرا مکمل نہیں ہوتا۔ مولانا کی مرکب اور مشکل سے سمجھ میں آنے والی شخصیت کو پیش نظر رکھکر اُن کے ادب کا تجزیہ کرنا

کوئی آسان کام نہیں۔ میں نے ان اوراق میں اس مشکل کام کو صرف اسی حد تک انجام دیا ہے کہ مولانا کی تحریروں کے اقتباسات پیش کر کے یہ بتا دیا ہے کہ یہ عکس اُن کے ذہنی تصورات کے کس گوشہ کی طرف ہماری رہنمائی کرتا ہے۔

کتابوں پر جو اخباری تبصرے شائع ہوا کرتے ہیں اُن میں سے اکثر یا تو ایک نامکمل اور سطحی تعارف ہوتے ہیں یا ایک تجارتی اشتہار یا یکسر مدح و ثنا یا بیشتر تعریض و تنقیص یا پھر ان دونوں کا ایک مرکب جس میں تلخ و شیریں اور نرم و گرم کو کچھ اس ترکیب سے ملا دیا جاتا ہے کہ مدح و ثنا کا حق بھی ادا ہو جائے اور کوئی یہ بھی نہ کہہ سکے کہ تنقید کا فرض ادا نہ ہوا!

میں نے جب مولانا کے ادب پر تبصرہ کرنے کا ارادہ کیا تو اس تبصرہ کیلئے مولانا کی شخصی اور معنوی زندگی کے حقائق کی تلاش و جستجو پہلی شرط قرار پائی۔ اس زندگی کے پس منظر میں اُس کے نفسیاتی خد و خال کو یا تو وہ شخص نمایاں کر سکتا ہے جس نے بہت قریب سے مولانا کا مطالعہ کیا ہو (اور ایسا تو مجھے کوئی بھی نظر نہیں آتا) یا پھر بدرجہ مجبوری تذکرہ اور الھلال اور البلاغ کے صفحات پر مولانا کے قلم کے بنائے ہوئے نقوش کی سطح کو کریدنا ہوگا۔ اور اُن کے اندر سے کرید کرید کر وہ سب کچھ نکالنے کی کوشش کرنی ہوگی جو کچھ مولانا نے خود اپنے متعلق فرمایا ہے اور جو کچھ خود اُن کی فطرت اور

نفسیات کا آئینہ دار ہے۔

۲

مولانا ایک بہت "مشکل" انسان ہیں۔ مشکل اس اعتبار سے کہ اُن کی شخصیت اپنی ایک مخصوص مرکزیت میں خلوت نشین رہتی ہے اور عوام کی نظر کا مرکز بنا گوارا نہیں کرتی۔ "مشکل" اس لئے بھی اُن کی انفرادیت عوام کی نفسیاتی سطح سے اس قدر بلند ہے کہ کوئی عامی کسی عام پیمانہ سے اُسے ناپ تول نہیں سکتا۔ جس طرح غلہ تولنے کی ترازو میں ہم موتی نہیں تول سکتے۔ اِسی طرح مولانا کی نفسیات کے لئے بھی کسی عام پیمانہ کے بجائے ایک مخصوص پیمانہ اور مقیاس اور ایک طاقتور خوردبین کی ضرورت ہے۔ مولانا کی یہ نفسیاتی کیفیت جس کا خود اُنہوں نے غبارِ خاطر کے مکتوبات میں بہت بلیغ اشاروں کے اندر ذکر فرمایا ہے۔ اُن کے اور اور عوام کے درمیان ایک اونچی دیوار بن گئی ہے۔ اس دیوار کے اس طرف سے اُس طرف کا ربط صرف ادب اور خطابت ہی کے ذریعہ سے قائم رہ سکا ہے۔ یہ ذہنی ربط بھی بہت کم ہو گیا جب سیاسی زندگی کے ہزار گونہ مشاغل نے مولانا کو

گھیرلیا اور یہ مشاغل اُن کی زندگی پر چھا گئے۔ چنانچہ غبارِ خاطر کی اشاعت کے وقت تک مولانا کے افکار سے عوام کا جو کچھ ذہنی ربط باقی رہا تھا وہ صرف مولانا کے افکار کی اُن قدیم تصویروں ہی کے ذریعہ باقی رہا تھا جو اَب الہلال البلاغ اور تذکرہ کے اوراق میں ڈھونڈنی پڑتی ہیں۔

اپنی ذہنی سطح سے نیچے، کسی عوامی سطح پر مولانا صرف دیر آشنا اور کم آمیز ہی نہیں بلکہ مشکل آشنا ہیں۔ عوام کی زندگی میں مولانا کی شخصیت کا تصور کچھ ایسا ہے کہ گویا اُن کے افکار کا ایک اونچا مینار ہے اور مینار پر ایک بند حجرہ ہے اور اس حجرہ میں مولانا کی معنوی شخصیت خلوت نشین ہے اور اس خلوت کے پردوں کو ہاتھ لگانا ایک عامی تو کیا خواص کے لئے بھی مشکل ہے۔

جتبک دہانِ زخم نہ پیدا کرے کوئی
مشکل کہ تجھ سے راہِ سخن وا کرے کوئی

علم و فضل کی یہ ایک جاگیرداری ہے اور یہ کوئی نئی چیز نہیں دنیا کی تاریخ ادبیات میں اس قسم کی انفرادیت کے بہت سے نمایاں نقوش موجود ہیں جن سے مولانا کے علم و فضل کی "جاگیرداری" کا موازنہ کیا جاسکتا ہے۔ البتہ اردو زبان کے تو دو ہی تین اہل قلم ہیں جن کو اس ذہنی خواصیہ Intellectual Pristocracy میں شمار کیا جاسکتا ہے۔ اور ان چند میں بھی سب سے زیادہ امتیاز مولانا ہی کی انفرادیت کو حاصل ہے۔ اُن کے تنہائی پسند اور عزلت کوش مزاج

کی توجیہہ سوائے اس کے کچھ ہو ہی نہیں سکتی۔ خود مولانا نے غبارِ خاطر کے اوراق پر اور نیز اپنی دوسری تحریروں میں اپنی خلوت کوشی اور اپنے اس ذہنی استثنا کی طرف جو اشارے کئے ہیں اُن کا ذکر بعد کے صفحات میں آئے گا۔

میں نے اپنی زندگی میں اس ملک کے دو بڑے آدمی ایسے دیکھے جن کی یہ خصوصیت تقریباً یکساں تھی۔ وہ شعریت جو اِن دونوں کے دلوں کے آتش خانوں کو گرم رکھتی تھی کسی اجنبی نظر کی حریف نہ تھی اور وہ لطافتیں جو اِن دونوں کے وجودِ معنوی کو آراستہ کرتی تھیں محسوس نہ ہو سکتی تھیں جب تک کہ اُن کے بہت قریب نہ جائیں۔ اور قریب جانے کے راستے از حد دشوار گذار تھے۔

اس معاملہ میں مولانا کے مثیل (ایک حد تک) حکیم اجمل خاں مرحوم تھے جو مولانا کے معدودے چند احباب خاص میں سے ایک تھے اُن کا شمار اہل قلم میں نہ تھا، مگر اُن کے گہرے احساسات شاعرانہ تھے۔ اُن کی بھی یہی حالت تھی کہ گویا اُن کے وجودِ معنوی پر ایک بھاری نقاب پڑی ہوئی تھی۔ جب کبھی اس نقاب کا کوئی گوشہ اُٹھ گیا، یا انفرادیت کے اس خول میں کوئی رخنہ پڑ گیا جس کے اندر وہ چھپی بیٹھی رہا کرتی تھی تو باہر کی سنجیدہ اور خشک شخصیت سے مختلف ایک اور ہی تصویر نظر آئی، یعنی ایک شاعر، مغنی اور آرٹسٹ کی روح سراپا شعر و موسیقی اور حد درجہ ذکی الحس۔ حکیم صاحب مرحوم کی اس

ذہنی خلوت میں چند ہی نیاز مند بار پا سکتے تھے اور صرف وہی جانتے تھے کہ اوپر کی سطح پر جو کیفیت بظاہر غرور، پندار، تشخص اور بے لوچ انانیت سمجھی جاتی تھی وہ صرف ایک پردہ تھا جس کے نیچے علم وفضل اور شعریت کی ایک دنیا آباد تھی یعنی اس نظام فلکی میں نظر سے دُور ایک رقاصۂ فلک بھی تھی جو ہمہ وقت مصروف رقص رہی ہوگی لیکن عوام کی نظروں سے پوشیدہ رہا اور شاید اُن کے وہم وگمان سے بھی دور۔

اس قسم کی فطرتوں کا مطالعہ، علم النفس کے نقطہ نظر سے اپنے اندر بہت بڑی وسعت رکھتا ہے۔ لیکن اس وقت تو اس پہلو کی طرف صرف اتنا ہی اشارہ کرنا ہے جتنا کہ مولانا کے ادب پر تبصرہ کرنے کے لئے ضروری تھا۔

اردو ادب میں دوسری نمایاں انفرادیت غالب کی ہے جس نے نہ صرف اپنے کلام کو شاعری کی عام رسم وراہ سے بالکل جدا کر لیا بلکہ عامی اصولوں کی تقلید کو بھی اپنے لئے باعث ننگ سمجھا۔ اُسے وبائے عام میں مرنا بھی گوارا نہ تھا۔ لیکن غالب ایک شاعر کے سوا کچھ نہ تھا اور مولانا اور حکیم اجمل خاں کے افکار کی دنیا بالکل دوسری ہے۔

بہر حال علم وفضل اور تفکر میں نہ سہی لیکن آرٹ اور شعر کی انفرادیت اور انانیت میں غالب ان دونوں کی انفرادیت کا حصہ دار ضرور

۳

(جس طرح شعر، تصویر اور راگ کا بلند درجہ غمگین کا ایک مقام ہے۔ اسی طرح ایک ایسی فطرت کے کمال کا کھوج بھی جیسی کہ حکیم صاحب مرحوم کی تھی یا مولانا کی ہے کسی غمگین بنیادی احساس ہی میں مل سکتا ہے۔ چونکہ حکیم صاحب مرحوم کی شخصیت کے مطالعہ کا مجھے کافی موقع ملا تھا۔ اس لئے میں نے ایک ایسی معنوی کیفیت کو پہنچاننے کے کچھ اشارے پائے تھے لیکن میں مولانا کے اس قدر قریب کبھی نہیں پہنچ سکا جس قدر کہ حکیم صاحب مرحوم کے قریب پہنچ سکا تھا۔ اس لئے اُن کی فطرت کے تقاضوں کو ان کی تحریروں ہی میں تلاش کرنا میرے لئے ضروری ہے۔

(مولانا کو دور سے دیکھکر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا انہوں نے ایک گنبد کے اندر جس کا کوئی دروازہ نہیں ہے (اور اگر ہے تو کوئی چور دروازہ ہے!) اپنے وجود معنوی کو بند کر رکھا ہے۔ یہ وجود عوام کی نظروں سے بچنا اور چھپنا چاہتا ہے یا تو اس لئے کہ بہت شرمیلا ہے یا اس لئے کہ ان نظروں کو اپنی حیثیت سے بہت کمتر پاتا ہے۔ مولانا کے چہرے کی سنجیدگی اور گفتگو کے تحمل کو لوگ غرور اور پندار سے منسوب کر دیتے ہیں اور اپنے فہم و ادراک کی حد تک وہ اس کے سوا کچھ کر بھی نہیں سکتے۔ لیکن یہ عالم درحقیقت ایک

غمگین احساس کا عالم ہے، ایک اُداس تنہائی کا اور افکار و وجدان کے مغموم رحجانات کا جن میں اُن کا کوئی شریک نہیں۔

غبارِ خاطر اور مولانا کی بعض تحریروں کو اگر ایک پیمانہ بنالیں تو اُس سے مولانا کی واردات قلب کا تھوڑا بہت اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ مگر اس پیمانہ کو بہت احتیاط کیساتھ استعمال کرنا ہوگا۔ ایسا نہ ہو کہ پڑھنے والے ان اوراق کے بعض مقامات پر طنز و مزاح کی کسی دل نشین جھلک سے دھوکہ کھا جائیں۔ درحقیقت اس طنز و مزاح کے پردوں میں بھی جس اذیت کوش اور اذیت نواز فطرت کا غمگین چہرہ پوشیدہ ہے اُس کے خد و خال کو بہت گہری نظر سے بین السطور تلاش کرنا ہوگا جو کوئی میری جستجو کے اس میدان میں قدم بقدم میرے ساتھ چلے وہ شاید ان اوراق کے غبار رنگیں میں ایک آرٹسٹ کی بلند مقام روح کے اضطراب اور ذوق طلب کی ایک جھلک دیکھ سکے۔

غبارِ خاطر اور مولانا کی دوسری تحریروں پر اس تبصرہ کا کوئی تعلق براہ راست نہ تو اُن علمی اور تاریخی مباحث سے ہے جن پر مولانا نے بہت کچھ لکھا ہے اور نہ اس تبصرہ کا کوئی علاقہ مولانا کے سیاسی عقاید اور مشاغل سے ہے۔ اس کے لئے تو ایک مقالہ نہیں بلکہ ایک بڑی کتاب لکھنی ہوگی۔ اس وقت تو مقصد صرف اتنا ہے کہ خود مولانا کی نفسیات کو اُن کی تحریر کے پردوں میں تلاش کیا جائے تاکہ اسی پس منظر میں مولانا کے فرمودات اور ادبی اسلوب بیاں کا تجزیہ کیا جا سکے۔ یہ مشکل کام کسی قدر آسان اس لئے ہو گیا کہ غبارِ خاطر کے مکتوبات

جو قلعہ احمد نگر میں زمانۂ اسیری کے احساسات کا ایک گوشہ پیش کرتے ہیں اس ارادے سے لکھے ہی نہیں گئے تھے کہ وہ کبھی شائع بھی ہوں گے۔ اس لئے اُن کے اندر مولانا کے افکار کا بہاؤ ایک صحرائی چشمہ کی طرح آزاد ہے۔ اُس کے بہاؤ میں کوئی رکاوٹ حائل نہیں۔ اس چشمہ پر نہ تو کوئی پُل باندھا گیا ہے، نہ اُس کے پانی پر ملاحوں کی بستیاں تیرتی ہیں۔ اور نہ اُس کا پانی بستیوں اور شہروں کے خس و خاشاک سے آلودہ ہے۔ یہ چشمہ ایک خاموش وادی کے آغوش میں اپنی فطرت کے مطابق بہتا چلا گیا ہے۔ اس نقطہ نظر سے مولانا کے ذہن کو سمجھنے کے لئے مولانا کی دوسری تحریروں پر غبار خاطر قابل ترجیح ہے۔ اس آئینہ کو سامنے رکھ کر میں مولانا کے افکار اور اُن کی ادبیت کا تجزیہ کرنے کی ایک ناتمام کوشش کرنا چاہتا ہوں۔ ایک دشواری یہ بھی ہے کہ مولانا نے اپنی اس نثر میں شعر کی تمام لطافتیں اس طرح سمودی ہیں اور شاعرانہ اشارات و کنایات سے یہ اسقدر کام لیا ہے کہ تنقید اور تبصرہ کی راہ دشوار گذار ہوگئی ہے اور اور مغالطے سنگ راہ ہو سکتے ہیں۔ اُن کی شعریت نے ایک چادر بن کر اُن کے حقیقی تاثرات کے چہرہ کو اس طرح ڈھانپ لیا ہے کہ بعض مقامات پر تو یہ سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے کہ کس نقطہ پر شاعری ختم ہوئی اور حقیقت شروع ہوئی!



مولانا کے آرٹ کی خصوصیات سے اُن کی نفسیات کا موازنہ کرنا اور ان دونوں کے درمیان صحیح توازن قائم رکھنا آسان نہیں۔ علاوہ بریں یہ کوشش اپنی قسم کی پہلی کوشش ہے اور شاید اردو ادب میں تو یہ پہلا ہی تجربہ ہے جس کے نتائج کی کوئی ضمانت نہیں دی جا سکتی۔ اس تمام تجربہ کے دوران میں مولانا کے ادب کی بنیادی حقیقت کو پیشِ نظر رکھنا ہوگا۔ اور وہ یہ ہے کہ جسطرح غالب نے اپنی نظم میں اسی طرح مولانا نے اپنی نثر میں کسی دوسرے اسلوب نگارش کی تقلید کو گناہ سمجھا ہے۔ یہ کوئی مصنوعی انداز تفاخر نہیں ہے بلکہ ایک قدرتی انفرادیت ہے کہ اس میں نہ تو کوئی دوسرا ادیب مولانا کا شریک ہو سکتا ہے اور نہ اُن کی انفرادیت اور اُن کے آرٹ کو اپنا سکتا ہے۔ مولانا کا ادبی اجتہاد نقل اور تقلید کی دسترس سے دور ہے۔ اگر اس مرصع نگاری میں تصنع ہوتا تو ہر کوئی اس کی نقل کر سکتا۔ لیکن چونکہ یہ فطرت کا اپنا آرٹ ہے اس لئے اس کے نقش و نگار بے تکان قلم سے کاغذ تک آتے ہیں اور فکر و نظر کے جواہر بکھیرتے چلے جاتے ہیں۔ گذشتہ تیس سال میں میری نظر کے سامنے

سینکڑوں اہل قلم نے مولانا کے اسلوب کی نقالی کرنی چاہی لیکن کوئی ایک بھی اس تقلید میں کامیاب نہ ہوسکا۔ لہٰذا مولانا کی تحریروں کا دوسری ادیبوں کے اسلوب بیاں سے موازنہ کرنا تو خارج از بحث ہے۔ اُن کے آرٹ کا دیوتا بہت غیورا ور مغرور ہے اور اپنی انفرادیت میں شرک کو گوارا نہیں کرتا۔ غبار خاطر کے مختصر پیش لفظ میں خود ہی اس طرف اشارہ فرماتے ہیں کہ :۔

نسخہ شوق بہ شیرازہ نہ گنجد زنہار
بگزارید کہ ایں نسخہ مجزّا ماند !

مولانا کے ادب کی بنیادی حقیقت کو سمجھنے کے لئے ناقدین کی خوش قسمتی یہ ہے کہ خود مولانا نے اپنے ادب کی فطرت کے بعض حقائق کو بے تکلف بے نقاب کردیا ہے۔ میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ مولانا کے طرز نگارش اور طرز فکر کے متعلق اپنے مقصد کے تحت کوئی علمی اصطلاح وضع کروں۔ اب جو دیکھتا ہوں تو مولانا نے خود ہی غبار خاطر کے اوراق پر اپنے آرٹ کے بنیادی عناصر کی نشاندہی فرمادی ہے۔ وہ "انانیتی ادب" Egotistic Literature کی اصطلاح میں اپنے ادب کی فطرت کو نامزد فرماتے ہیں۔ ایک پورا مکتوب اسی موضوع پر ما دی ہے جس میں وہ اپنے ادب کی فطرت کے اس تقاضے کو بہت ہی معنی خیز انداز میں بیان فرماتے ہیں :۔

ہماری درماندگیوں کا عجب حال ہے۔ ہم اپنے ذہنی افکار

کو ہر چیز سے بچا لے جا سکتے ہیں مگر خود اپنے آپ سے بچا نہیں سکتے۔ ہم کتنا ہی ضمیرِ غایب اور ضمیر مخاطب کے پردوں میں چھپ کر ملیں لیکن ضمیر متکلم کی پرچھائیں پڑتی ہی رہے گی۔ ہم جہاں جاتے ہیں ہمارا سایہ ہمارے ساتھ جاتا ہے۔ ایک ادیب، ایک شاعر ایک مصور، ایک اہل قلم کی " انا نیت " کیا ہے ؟ ابھی نہ تو فلسفہ واخلاق کے مذہب " انا " کا رُخ کیجئے نہ "خودی" مصطلحۂ تصوف میں جائیے۔ صرف ایک عام تخئیلی زاویہ نگاہ سے معاملہ کو دیکھیئے۔ آپکو دکھائی دے گا کہ یہ انانیت دراصل اس کے سوا کچھ نہیں کہ اُس کی فکری انفرادیت کا ایک قدرتی سرجوش ہے جسے وہ دَبا نہیں سکتا"

اس "انانیت" میں ضرورت سے زیادہ رنگ آمیزی کے نقائص کا تجزیہ فرماتے ہوئے **مولانا** خود اپنی انانیت کے ردعمل کی طرف اشارہ کرتے ہیں :-

" اس مشکل سے صرف خال خال مصنف ہی عہدہ برآ ہو سکتے تھے اور ہوئے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنی "انانیت" کو بغیر کسی نمائشی وضع میں سجائے دوسروں کے سامنے لے آنے کی صلاحیت

رکھتے ہیں۔ دنیا کے سامنے اُن کی " انانیت" آئی
مگر اس طرح آئی جیسے ایک بے تکلف آدمی بغیر
سج دھج بنائے سامنے آکھڑا ہو۔ یہ بات کہ
ایک آدمی بغیر کسی بناوٹ کے اپنی واقعی صورت
میں سامنے آگیا نمود حقیقت کی ایک خاص دلکشی
رکھتی ہے! ور اس لئے دنیا کی نگاہوں کو بے اختیار
اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ جو خاص خاص ادیب ایسا
کرسکے اُن کی " میں " خود اُن کے لئے کتنی ہی
بڑی اور دوسروں کے لئے کتنی ہی چھوٹی واقع
ہوئی ہو لیکن دنیا اُس کی دلپذیری سے انکار
نہ کرسکی۔ دنیا کو اُن کی " انانیت " کی مقدار
ناپنے کی مہلت ہی نہ ملی۔ وہ تو اُس کی بے تکلفانہ
واقعیت کو دیکھکر بیخود ہو گئی۔

ادیبوں اور شاعروں اور فنکاروں کی " انانیت " کے مختلف
مظاہر کا تجزیہ کرتے ہوئے **مولانا** اس مظاہرہ " انانیت " کے
بیش و کم سے اس طرح بحث کرتے ہیں کہ :۔

لیکن یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیئے کہ انسان کے
تمام معنوی محسوسات کی طرح اُس کی انفرادیت کی
نمود بھی مختلف حالتوں میں مختلف نوعیتیں رکھتی ہے

کبھی وہ سوتی رہتی ہے، کبھی جاگ اُٹھتی ہے کبھی اُٹھکر بیٹھ جاتی ہے اور پھر کبھی زور شور سے اُچھلنے لگتی ہے۔ انسان کی ساری قوتوں کی طرح وہ بھی نشو ونما کی محتاج ہوئی۔ جس طرح ہر انسان کا ذہن وادراک یکساں درجہ کا نہیں ہوتا اسی طرح "انفرادیت" بھی ہر دیگ میں ایک ہی طرح نہیں اُبلتی۔ مدارج کا یہی فرق ہے جو ہم تمام ادیبوں، شاعروں مصوّروں اور موسیقی نوازوں میں پاتے ہیں۔ اکثروں کی انفرادیت بولتی ہے مگر دھیمے سُروں میں بولتی ہے۔ بعضوں کی انفرادیت اس قدر پُرجوش ہوتی ہے کہ جب کبھی بولیگی تو سارا گرد وپیش گونج اُٹھیگا۔

یک بار نالہ کردہ ام از درد اشتیاق
از شش جہت ہنوز صدا می تواں شنید

اب اس سوال کو کہ مولانا کی انفرادیت کا مقام اُن اکثروں سے قریب ہے جن کی "انانیت" دھیمے سُروں میں بولتی ہے یا اُن "بعضوں سے قریب تر ہے جو جب کبھی بولتے ہیں تو سارا گرد وپیش گونج اُٹھتا ہے مولانا کے ادب کا گہرا مطالعہ ہی طے کرسکتا ہے میں نے تو مولانا کے ادب میں یہ دونوں کیفیتیں دیکھی ہیں۔ اس

جمال کیساتھ جلال کی شان وہی ہے کہ مولانا کے ہر لفظ سے سارا گرد و پیش گونج اُٹھتا ہے۔ اُن "بعضوں" کا ذکر کرتے ہوئے جو زیادہ پُرجوش انفرادیت رکھتے ہیں مولانا نے اپنی یہ رائے ظاہر کی ہے کہ:-

"ایسے افراد اپنی "میں" کا سرجوش کسی طرح دبا نہیں سکتے۔ اُن کی خاموشی بھی چیخنے والی اور اُن کا سکون بھی پُرشور ہوتا ہے۔ .... ایسے افراد جب کبھی "میں" بولتے ہیں تو اُس میں قصداً بناوٹ اور نمائش کو کوئی دخل نہیں ہوتا۔ وہ سراپا حقیقت حال ہی کی ایک بے اختیارانہ چیخ ہوتی ہے .... ایسے اخص الخواص افراد کو عام معیار نظر سے دور رکھنا پڑے گا ایسے لوگ فکر و نظر کی عام ترازوؤں میں نہیں تولے جا سکتے ادب و تصنیف کے عام قوانین اُنہیں اپنے کلّیوں سے نہیں پکڑ سکتے۔ زمانہ کو اُن کا یہ حق تسلیم کر لینا پڑتا ہے کہ وہ جتنی مرتبہ بھی چاہیں "میں" بولتے رہیں۔ اُنکی ہر "میں" اُن کی ہر "وہ" اور "تم" سے زیادہ دلپذیر ہوتی ہے۔

"انانیتی ادب" کے اخص الخواص کیسے افراد ہوتے ہیں جن کا ادب

عام ترازو میں نہیں تولا جا سکتا اور جن کو ادب و تصنیف کے عام کلیات پکڑ نہیں سکتے اور جن کی " میں " ہزار " وہ " اور " تم " سے زیادہ دلپذیر ہوتی ہے ؟ اس اشارہ کو مولانا کا ادب سامنے رکھکر سمجھ لینا کچھ ایسا دشوار تو نہیں ۔ اہم یہ جان لیں تو پھر ہمیں یہ بھی مان لینا ہوگا کہ مولانا نے خود اپنے اسلوب نگارش اور طرز تفکر کے تجزیہ کا یہ ایک معیار ہمیں بتا دیا ہے ۔



اگر اس انفرادیت اور انانیت کے بے پناہ اقتدار کو تسلیم کر کے آگے بڑھیں تو مولانا کی نفسیات کے پیمانہ میں اُن کے ادب کو ناپنے اور تولنے کے بہت سے ڈھنگ معلوم ہو جاتے ہیں اور بہت سی راہیں کھُل جاتی ہیں ۔ اُن کی تحریروں میں اور خصوصاً غبار خاطر کے مکتوبات میں مولانا کی نفسیات کا جو نقشہ اُبھرتا ہے اُس میں سب سے نمایاں خانہ وہ ہے جہاں ہم خود مولانا کے قلم سے اُن کی فطرت کی تصویریں متحرک پاتے ہیں ۔ اس خانہ میں مولانا کی جو ذہنی کیفیت نمایاں ہوتی ہے اُس کے بہت سے نام رکھے جا سکتے ہیں ، خودداری ، انانیت ، انفرادیت ، کم آمیزی اور احساس برتری جو " عقلیت " الخ

Intellect کا ایک طبقاتی امتیاز ہے۔ یہ طبقہ اپنے کو عمومیت سے جدا رکھتا ہے اور ہر معمولی واقعہ میں بھی اپنے لئے امتیاز خاص کا کوئی نہ کوئی پہلو نکال لیتا ہے۔ مگر شہد کی محتاط مکھی کی طرح پھول کے سوا کسی چیز کو مس کرنا بھی اپنے لئے دامن آلودگی سمجھتا ہے۔ وہ اپنے بلند اور مخصوص مقام پر کسی ایسی عمومیت کو — خواہ وہ قلم اور زبان ہی کی ہو۔ پسند نہیں کرتا جو اُس کی سرفراز "عقلیت" کے سانچے میں نہ ڈھل سکے اور اس کی کسوٹی پر پوری نہ اتر سکے۔ مولانا اپنے ایک مکتوب میں اپنے ذوق نگارش کا ذکر کرتے ہوئے اپنی قید کی پابندیوں میں بھی اپنے لئے ایک امتیاز پیدا کر لیتے ہیں۔ شروع تو اسطرح کرتے ہیں کہ :-

" قید خانہ سے باہر کی دنیا کے اب سارے رشتے کٹ چکے تھے اور مستقبل پردۂ غیب میں مستور تھا۔ کچھ معلوم نہ تھا کہ یہ مکتوبات کبھی مکتوب الیہم تک بھی پہونچ سکیں گے یا نہیں۔ تاہم ذوق مخاطبت کی طلبگاریاں کچھ اس طرح دل مستمند پر چھا گئی تھیں کہ قلم اُٹھا لیا تو پھر رکنے کو جی نہیں چاہتا

اس ذوق نگارش کا بیان ختم اس انداز سے کرتے ہیں کہ :-

لوگوں نے نامہ بری کا کام کبھی قاصد سے لیا، کبھی

بال کبوتر سے ، ہمارے حصہ میں عنقا آیا۔

بات تو سیدھی سادی ہے اور کہنا صرف یہی ہے کہ یہ مکتوبات اس یقین کے ساتھ نہیں لکھے گئے تھے کہ وہ کبھی مکتوب الیہ تک پہنچ سکینگے۔ لیکن ادیب نے اس معمولی بات میں بھی اپنے انداز نگارش کیلئے امتیاز کا ایک پہلو پیدا کرلیا۔ یہ کوئی سخن گسترانہ بات نہیں بلکہ حقیقتاً مولانا کے افکار کی اس انانیت اور انفرادیت کا ایک عکس ہے جو ہر بات پر انگلی اُٹھاکر کہتی ہے کہ اس بات کو یوں نہ کہو جیسے عوام کہتے ہیں! اپنی زندگی کے ایک غمناک موقعہ کا ذکر کرتے ہوئے مولانا نے اپنی خودداری اور پندار اور اپنے غیور مزاج کی کیفیت کا ایک پہلو اس طرح واضح کیا ہے کہ جس وقت اُن کی اہلیہ کی آخری علالت کی تشویشناک خبریں آرہی تھیں تو وہ یہ گوارا نہ کرتے تھے کہ اُن کی تشویش اور فکرمندی قیدخانہ کے ساتھیوں پر ظاہر ہوجائے چنانچہ اپنی اس "کمزوری" کو اپنے معنوی وجود کی حدوں سے باہر نکلنے کی انہوں نے کبھی اجازت نہ دی۔ اُس کو غیروں کی نظر سے پوشیدہ رکھنے کے لئے وہ اس پر ظاہرداری کے پردے ڈالتے تھے۔ جس مکتوب میں دبے ہوئے سوز وگداز کے ساتھ اپنی اہلیہ کی علالت اور وفات کا ذکر کرتے ہیں اسی میں اپنے "مغرورانہ تحمل" کا بھی اس طرح تذکرہ فرماتے ہیں کہ:-

" جیلر اخبار لیکر سیدھا میرے کمرے میں آتا ہے

جوں ہی اُس کے دفتر سے نکلنے اور چلنے کی آہٹ
شروع ہوتی ہے دل دھڑکنے لگتا تھا کہ نہیں معلوم
آج کیسی خبر اخبار میں ملیگی۔ لیکن پھر میں فوراً چونک
اُٹھتا۔ میرے صوفے کی پیٹھ دروازہ کی طرف تھی
اس لئے جبتک ایک آدمی اندر آکر سامنے کھڑا نہ
ہو جائے میرا چہرہ دیکھ نہیں سکتا۔ جب جیلر آتا
تھا تو میں حسب معمول مسکراتے ہوئے اشارہ کرتا
تھا کہ اخبار ٹیبل پر رکھ دے اور پھر لکھنے میں مشغول
ہو جاتا کہ گویا اخبار دیکھنے کی کوئی جلدی نہیں!
میں اعتراف کرتا ہوں کہ یہ ساری ظاہرداریاں
دکھاوے کا ایک پارٹ تھیں جس سے دماغ کا ایک
مغرورانہ احساس کھیلتا رہتا تھا اور اس لئے
کھیلتا تھا کہ کہیں اُس کے دامن صبر و قرار پر
بے حالی اور پریشاں خاطری کا کوئی دھبہ نہ
لگ جائے . . . . بالآخر ۹ اپریل کو زہر غم
کا یہ پیالہ لبریز ہو گیا۔"

اس تمام سوز و گداز میں جس کی آواز کو مولانا بند کرتے ہیں اُن
کے دماغ کا مغرورانہ احساس" بالکل عریاں ہے۔ انفرادیت کے اس
غرور نے زہر غم کے پیالہ کا اتنا ذکر بھی شاید صرف اس لئے گوارا کیا کہ

مولانا جانتے تھے کہ یہ مکتوب مکتوب الیہ تک پہنچنے والا نہیں۔ مولانا تسلیم کرتے ہیں کہ اس "کمزوری" پر پردہ ڈالنے کے لئے جسے وہ انفرادی وقار کے لئے توہین آمیز سمجھتے ہیں انہوں نے مسکراتی ہوئی ظاہرداریاں بھی اپنے لئے جائز سمجھیں!

دماغ کے اس "خوددارانہ احساس" کو مولانا نے ان مکاتیب میں اور اپنی دوسری تحریروں میں بھی باربار مختلف انداز سے ظاہر کیا ہے اور اس طرح اپنی فطرت کی اس خصوصیت کے خدوخال کو بے نقاب کردیا ہے۔ کم آمیزی، خودرفتگی اور خودشناسی اور انانیت خود اُن ہی کے الفاظ ہیں جو اُنہوں نے جابجا اپنی ذہنی زندگی کی مخصوص اُفتاد کے لئے استعمال کئے ہیں۔ یہ مولانا کی زندگی کے ایسے عناصر ہیں کہ اگر اُن کی حقیقت کو نہ سمجھا جائے تو پھر مولانا کی زندگی کے کسی ایک گوشہ سے بھی واقف ہونا مشکل ہے۔ ایک مکتوب میں فرماتے ہیں کہ :-

"یہاں زندگی بسر کرنے کے دو ہی طریقے ہیں جنہیں ابوطالب کلیم نے دو مصرعوں میں بتا دیا ہے :-

طبعے بہم رساں کہ بسازی بہ عالمے
یا ہمتے کہ از سرِ عالم تواں گرفت

پہلا طریقہ اختیار نہیں کرسکتا کیونکہ اُس کی طبیعت ہی نہیں لایا۔ ناچار دوسرا اختیار کرنا پڑا۔

کارِ مشکل بود، بر خویش آساں کردہ ایم

ایک دوسرے مکتوب میں فرماتے ہیں :-

"انسان اپنی زندگی کے اندر کتنی مختلف زندگیاں بسر کرتا ہے۔ مجھے بھی اپنی زندگی کی دو قسمیں کر دینی پڑیں۔ ایک قید خانہ کے باہر کی ایک اندر کی... قید کے باہر کی زندگی میں میں اپنی طبیعت کی افتاد بدل نہیں سکتا۔ خود رفتگی اور خود مشغولی مزاج پر چھائی ہوئی رہتی ہے۔ دماغ اپنی فکروں سے باہر آنا نہیں چاہتا اور دل اپنی نقش آرائیوں کا گوشہ چھوڑنا نہیں چاہتا۔ بزم و انجمن کے لئے بار خاطر نہیں ہوتا لیکن یار شاطر بھی بہت کم بن سکتا ہوں۔

پھر ایک مقام پر فرماتے ہیں :-

انسان کا اصل عیش دماغ کا عیش ہے، جسم کا نہیں ہے۔ میں لذیتہ سے اُن کا دماغ لے لیتا ہوں، جسم اُن کے لئے چھوڑ دیتا ہوں...... اور غور کیجیئے تو یہ بھی ہمارے وہم و خیال کا ایک فریب ہے کہ سر و سامان کار ہمیشہ اپنے سے باہر ڈھونڈتے رہتے ہیں۔ اگر یہ پردہ فریب ہٹا کر دیکھیں تو صاف

نظر آجائے کہ وہ ہم سے باہر نہیں، خود ہمارے اندر
ہی موجود ہے۔

مولانا نے بار بار اور پوری صراحت کے ساتھ اپنی کم آمیزی اور خلوت پسندی اور رسم وراہ عام سے اپنی بیزاری کا ذکر کیا ہے۔ ان فرمودات کو پڑھنے والے کے دل میں اس امر کے متعلق کوئی شبہ باقی نہیں رہ سکتا کہ مولانا کی فطرت عوامی زندگی کے تمام راستوں سے الگ اپنا راستہ بناتی ہے۔ اور یقیناً عوامی زندگی سے وہ اتصال جو انہیں سیاسی اغراض کے تحت قائم رکھنا پڑتا ہے اُن کی طبیعت پر گراں گزرتا ہوگا۔ حالت تو یہ ہے کہ سونے جاگنے اور کھانے پینے میں بھی اُن کا مسلک تقلید نہیں بلکہ اجتہاد ہے۔ مثلاً اپنے سونے اور جاگنے کے اوقات کا ذکر کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:۔

سوچتا ہوں تو زندگی کی بہت سی باتوں کی طرح اس معاملہ میں بھی ساری دنیا سے الٹی ہی چال میرے حصہ میں آئی۔ دنیا کے سونے کا جو وقت سب سے بہتر ہوا وہی میرے لئے بیداری کی اصلی پونجی ہوئی۔ لوگ ان گھڑیوں کو اس لئے عزیز رکھتے ہیں کہ میٹھی نیند کے مزے لیں، میں اس لئے عزیز رکھتا ہوں کہ بیداری کی تلخ کامیوں سے لذت اندوز ہوتا رہوں۔

خلق را بیدار باید بود ز آب چشم من
ایں عجب کاں دم کہ می گریم کسے بیدار نیست

ایک بڑا فائدہ اس عادت سے یہ ہوا کہ میری تنہائی میں اب کوئی خلل نہیں ڈال سکتا۔ میں نے دنیا کو ایسی جراتوں کا سرے سے موقع ہی نہیں دیا۔ وہ جب جاگتی ہے میں سو رہتا ہوں، جب سو جاتی ہے تو اُٹھ بیٹھتا ہوں۔

جلوت سے یہ بیزاری اور خلوت سے یہ لگاؤ وہ فرماتے ہیں کہ عادتوں کی طرح پیدا نہیں ہوا بلکہ فطری ہے:۔

ابتدا ہی سے طبیعت کی افتاد کچھ ایسی واقع ہوئی تھی کہ خلوت کا خواہاں اور جلوت سے گریزاں رہتا تھا۔ یہ ظاہر ہے کہ زندگی کی مشغولیتوں کے تقاضے اس طبع وحشت سرشت کے ساتھ نبھائے نہیں جا سکتے۔ اس لئے بہ تکلف خود کو انجمن آرائیوں کا خوگر بنانا پڑتا ہے مگر دل کی طلب ہمیشہ بہانے ڈھونڈتی رہتی ہے۔ جوں ہی ضرورت کے تقاضوں سے مہلت ملی اور وہ اپنی کام جوئیوں میں لگ گئی

جو لوگ مولانا کو کسی قدر قریب سے دیکھ سکے ہیں وہ تو یہ دیکھتے ہیں کہ اب اس "طبع وحشت سرشت" کی اس سرشت میں بہت

اضافہ ہو چکا ہے۔ چنانچہ اب زندگی کی مشغولیتوں کے تقاضے بھی بسا اوقات خلوت کی کامجوئیوں پر حاوی نہیں ہو سکتے۔ بلکہ اب تو طبیعت کی اس افتاد نے مولانا کو پہلے سے بہت زیادہ خلوت کی محفل آرائیوں کا خوگر بنا دیا ہے اور اس اُفتاد سے ایک استغنا کی حالت میں منتقل ہو کر وہ اب زیادہ مطمئن ہو گئے ہیں :۔

طبیعت کی اس افتاد نے بڑا کام یہ دیا کہ زمانہ کے بہت سے حربے میرے لئے بیکار ہو گئے۔ لوگ اگر میری طرف سے رُخ پھیر لیتے ہیں تو بجائے اس کے کہ دل گلہ مند ہو اور منت گذار ہونے لگتا ہے کیونکہ جو ہجوم لوگوں کو خوش حال کرتا ہے میرے لئے بسا اوقات نا قابل برداشت ہو جاتا ہے۔ میں اگر عوام کا رجوع و ہجوم گوارا کرتا ہوں تو یہ میرے اختیار کی پسند نہیں ہوتی۔ اضطرار و تکلف کی مجبوری ہوتی ہے۔ میں نے سیاسی زندگی کے ہنگاموں کو نہیں ڈھونڈا تھا۔ سیاسی زندگی کے ہنگاموں نے مجھے ڈھونڈھ نکالا۔ میرا معاملہ سیاسی زندگی کے ساتھ وہ ہوا جو غالب کا شاعری کے ساتھ ہوا تھا

ما نہ بودیم بدیں مرتبہ راضی غالب!
شعر خود خواہش آں کرد کہ گردد فن ما

. . . . جب کبھی میں قید خانہ میں
سنا کرتا ہوں کہ فلاں قیدی کو قید تنہائی کی سزا
دی گئی تو حیران رہ جاتا ہوں کہ تنہائی آدمی کے
لئے سزا کیسے ہو سکتی ہے۔ اگر دنیا اسی کو سزا
سمجھتی ہے تو کاش ایسی سزائیں عمر بھر کے لئے
حاصل کی جا سکیں۔

اپنی طبیعت کے اس سانچے کے بے لوچ استحکام کے متعلق مولانا اعتراف کرتے ہیں کہ اب یہ سانچہ "اتنا پختہ ہو چکا ہے کہ اُسے توڑا تو جا سکتا ہے مگر موڑا نہیں جا سکتا"۔ بلکہ مولانا کو مدادب کی حد پر کھڑے ہو کر دیکھنے والے تو اب یہاں تک کہتے ہیں کہ یہ سانچہ تو اب نہ توڑا جا سکتا ہے نہ موڑا جا سکتا ہے! اس باب میں مولانا عوام کی غلط فہمیوں اور بدگمانیوں کی زد سے بہت دور نکل گئے ہیں۔ خود ہی فرماتے ہیں:۔

اس افتاد طبیعت کے ہاتھوں ہمیشہ طرح طرح کی
بدگمانیوں کا مورد رہتا ہوں۔ اور لوگوں کو حقیقت
حال سمجھا نہیں سکتا۔ لوگ اس حالت کو غرور اور
پندار پر محمول کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ میں دوسروں

کو سبکسر تصور کرتا ہوں اس لئے اُن کی طرف بڑھتا
نہیں، حالانکہ مجھے خود اپنا ہی بوجھ اٹھنے نہیں دیتا۔
دوسروں کی فکر میں کہاں رہ سکتا ہوں. غنی
کشمیری نے ایک شعر کیا خوب کہا ہے:۔

طاقت برخاستن از گردنما کم نہ ماند!
خلق پندارد کہ مے خوردست ومست افتادہ است

اپنے ذہنی وجود کو مولانا عوام کی عمومیت سے اس قدر دور، بعید اور اجنبی قرار دیتے ہیں کہ وقت کے تقاضوں کی تعمیل جس پر وہ اپنے قول کے مطابق کبھی کبھی با دل ناخواستہ رضا مند ہو جاتے ہیں اِن کی بنیادی فطرت سے متصادم ہوتی ہے۔ غبار خاطر کے مکتوبات میں وہ بار بار پڑھنے والے کو اس حقیقت کے تسلیم کرنے پر مجبور کرتے ہیں کہ اُن کی اور عوام کی زندگی کے درمیان کوئی بنیادی حقیقت مشترک نہیں ہے۔ مثلاً:۔

طبیعت کی بے میل افتاد فکر وعمل کے کسی گوشہ میں
بھی وقت اور رسم کے پیچھے نہ چل سکی۔ اُسے وجود کا نقص
کہئے لیکن یہ ایک ایسا نقص تھا کہ جو اوّل روز سے
طبیعت اپنے ساتھ لائی تھی۔ زمانہ جو قدرتی طور پر
موسمی چیزوں کا دلدادہ ہوتا ہے اس ناوقت کے
پھل میں کیا لذت پا سکتا تھا۔ لوگ کھاتے ہیں تو مزا

نہیں ملتا۔ تاہم اس بے مزگی پر بھی اپنی قیمت ہمیشہ
گراں رہی۔ لوگ جانتے ہیں کہ مزا ملے یا نہ ملے مگر یہ
جنس ارزاں نہیں ہوسکتی۔

متاع من کہ نصیبش مبادا ارزانی

. . . . جس جنس کی بھی عام مانگ
ہوئی وہ میری دوکان میں جگہ نہ پا سکی۔ لوگ بازار میں
ایسی چیزیں ڈھونڈھ کر لائیں گے جن کا رواج عام ہو
اوروں کے لئے پسند و انتخاب کی جو علت ہوئی وہی
میرے لئے ترک و اعراض کی علت بن گئی۔ انہوں نے
دوکانوں میں ایسا سامان سجایا جس کے لئے سب
کے ہاتھ بڑھیں۔ میں نے کوئی چیز ایسی رکھی ہی نہیں
. . . . لوگ بازار میں دوکان لگاتے ہیں
تو ایسی جگہ ڈھونڈھ کر لگاتے ہیں کہ جہاں خریداروں کی
بھیڑ لگتی ہو۔ میں نے جس دن اپنی دوکان لگائی تو ایسی
جگہ ڈھونڈھ کر لگائی جہاں کم سے کم گاہکوں کا گذر ہوسکے
. . . . مذہب میں، ادب میں، سیاست
میں فکر و نظر کی عام راہوں میں جس طرف بھی نکلنا پڑا
اکیلا ہی نکلنا پڑا۔ کسی راہ میں بھی وقت کے قافلوں
کا ساتھ نہ دے سکا۔

اس موقعہ پر مولانا کے متعلق ایک دلچسپ واقعہ "تذکرہ" کے ناشر ماسٹر فضل الدین صاحب کے قلم سے نقل کرتا ہوں۔ یہ فضل الدین صاحب ایک زمانہ میں مولانا کے معتمد اور اُن کے صحافتی کاروبار کے مہتمم تھے "تذکرہ" کے ساتھ اُنہوں نے چاہا کہ مولانا کی ایک تصویر بھی شائع ہو۔ لیکن مولانا نے اس تجویز کو ناپسند فرمایا۔ اس واقعہ کی نسبت ماسٹر فضل الدین صاحب اپنے مقدمہ میں لکھتے ہیں کہ:-

الہلال میں دنیا جہان کی تصویریں نکلتی رہیں مگر لوگوں کے سخت اصرار پر بھی اُنہوں نے کبھی اپنا فوٹو شائع نہیں کیا۔ انجمن اعانت نظر بندان دہلی نے بار بار اُن سے فوٹو طلب کیا مگر اُنہوں نے نہ بھیجا۔ سید فضل الرحمٰن نے اخبار جمہور کلکتہ میں اُن کے فوٹو کا اعلان شائع کیا تھا اُس پر وہ سخت برہم ہوئے اور بڑا ہی سخت خط اُن کو لکھا۔ پھر مجھے لکھا کہ جس قدر کاپیاں اُنہوں نے تیار کی ہیں میری طرف سے خرید کر رکھ لو اور شائع نہونے دو۔ پھر جب قاضی عبدالغفار صاحب ایڈیٹر جمہور اُن سے ملنے رانچی گئے تو اُن سے بھی وعدہ لیا کہ اخبار میں ایک نوٹ اس مضمون کا درج کرا دیں گے کہ یہ کارروائی بلا اُن کے علم کے ہوئی مگر اُنہوں

نے درج نہیں کیا[1] - میں ان تمام موقعوں پر میں سمجھتا
رہا کہ یہ مخالفت یا تو انکسار طبع کی بنا پر ہے یا اُنکی طبیعت
کے اُس عام خاصہ کا نتیجہ ہے کہ جو بات عام طور پر لوگ
کر رہے ہوں اُس سے خود پرہیز کرتے ہیں"

اس کے بعد فضل الدین صاحب نے لکھا کہ مولانا کی مخالفت تصویر کے متعلق شرعی امتناع کے خیال پر مبنی تھی۔ لیکن وہ اس "شرعی امتناع" کے خیال سے مطمئن نہ تھے۔

یہ واقعہ ۱۹۱۹ء کا ہے اور گزشتہ تیس سال میں ہندستان کے دریاؤں میں بہت پانی بہہ گیا ہے اور ہمارے سامنے یہ بحث نہیں کہ تصویر کے متعلق شرعی حکم کیا ہے بلکہ کہنا صرف یہ ہے کہ شریعت کا حکم جو بھی ہو لیکن مولانا کی فطرت کا بھی ایک حکم ہے جس کی طرف مولوی فضل الدین نے اوپر کی سطروں میں اشارہ کیا ہے۔

خود تذکرہ کے بعض دوسرے مقامات پر مولانا نے مذہبی مسائل میں بھی تقلید سے اپنی بیزاری اور اپنے مجتہدانہ طرز فکر پر زور دیکر آج سے تیس سال پہلے ہی اپنی خودشناسی اور انفرادیت کو واضح کر دیا تھا۔ تذکرہ کے صفحات پر اپنے متعلق فرماتے ہیں کہ:-

" جس حال میں رہے نقص اور ناتمامی سے دل کو

---

[1] مجھے ایسا کوئی واقعہ یاد نہیں۔ (ع)

ہمیشہ گریز رہا۔ اور شیوہ تقلید اور روش عام سے
پرہیز۔ جہاں کہیں رہے اور جس رنگ میں رہے،
کبھی کسی دوسرے کے نقش قدم کی تلاش نہ
ہوئی۔ اپنی راہ خود ہی نکالی اور دوسروں کے لئے
اپنا نقش قدم رہنما چھوڑا........ توفیق الٰہی
کی سینکڑوں راہیں ہیں، ہدایت اور تربیت غیبی
کے ہزاروں بھیس ہیں۔ سب سے زیادہ آسان
اور پرُ امن راہ یہ ہے کہ رہنمایان طریق میں سے کسی
صاحب ارشاد کی صحبت حاصل ہو جائے۔ لیکن
میں صاف صاف کہتا ہوں کہ اس بارے میں میری
درماندگی و بیکسی کسی متعارف وسیلہ ہدایت و ارشاد
کی رہین منت نہیں ہے۔ حالات جیسے بھی رہے
سب کے سب اُس حالت سے یکسر متضاد تھے جن
تک بتدریج رسائی میسر آئی۔ قطع نظر اس معاملہ خاص
کے عقائد و اعمال عادات و خصایل فکر و نظر طرز و روش
کوئی بات بھی تو ایسی نہیں جس کو اپنے قدرتی حالات
کے مطابق پاتا ہوں۔ پس اپنی شکستگی اور خستگی
نہ تو کسی ہاتھ کی ممنون ہے نہ کسی زبان کی نہ خاندان
کی، نہ تعلیم و تربیت ظاہری کی، جو کچھ پایا ہے

صرف بارگاہِ عشق سے پایا ہے جتنی رہنمایاں ملیں
صرف اسی مرشد فیض اور ہادی طریق سے ملیں۔
درد بن کر آیا تھا مگر درماں بن کر گیا۔ مرض بھی وہی
تھا، شفا بھی اُسی سے ملی۔

تذکرہ کی اشاعت سے ۹ سال پہلے یعنی آج سے تقریباً ۸۰ سال پہلے مولانا عشق مجازی میں اپنے ایک اُلجھاؤ کی طرف بار بار اشارے کرتے ہیں مگر اُس کی تفصیل بیان نہیں فرماتے تاہم وہ تسلیم کرتے ہیں کہ اسی عشق مجازی نے اُنہیں خود شناسی کی راہ بتائی۔ اپنی زندگی کے اس واقعہ کو وہ اپنی ذہنی انانیت کے نشو ونما کا ایک نشان راہ سمجھتے ہیں۔ تذکرہ کے اوراق پر مجاز سے حقیقت کی طرف اپنی زندگی کے رُخ کے بدلنے کی روئیداد ایک عجب وارفتگی کے ساتھ بیان فرماتے ہیں:۔

"اپنی غفلت پرستیوں کا تو یہ حال تھا۔ اُدھر کارفرمائے غیب کا فیصلہ کچھ اور ہی ہو چکا تھا .... ناگہاں جاذبہ توفیق الٰہی پردہ عشق مجاز میں نمودار ہوا اور ہوس پرستی کی آوارگیوں نے خود بخود شاہراہِ عشق و محبت تک پہنچا دیا۔ اس سفر کی سب سے اقرب راہ منزل مجاز ہی سے ہو کر نکلی .... ذرے ذرے کو گرم گفتار پایا، پتے پتے کو مکتوب و مسطور دیکھا پھولوں نے زبان کھولی، پتھروں نے اُٹھ اُٹھ کر اشارے

سب نے نقاب اتار دیئے، ....کئے
سب پردے چھلنی ہو گئے۔ بادل کو پکڑا تو سازِ ہستی
کا طنبورہ نکلا، بجلی کو پاس بلایا تو لب ہائے راز کا
ایک تبسم آشکار نکلی۔ ہوا کے جھونکے مٹھیوں میں آگئے
سمندر نے اپنی ساری موجیں ختم کر دیں مگر پھر
بھی ہمارے ہاتھ کا پیالہ نہ بھرا........ اللہ اللہ
دولت وسعادت وقبولیت کی فراوانی، اور سبحان اللہ
بخشش ولطف غیبی کی بے پایانی......

ایک دن ترقی پسند ادیبوں کی ایک صحبت میں مولانا کی نفسیات پر گفتگو ہو رہی تھی، حاضرین میں سے ایک صاحب نے یہ اصول پیش کیا کہ نفسیات کا مطالعہ، جنسی زندگی کے مطالعہ کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ دیر تک اس نظریہ پر بحث ہوتی رہی اور میں تو شروع ہی سے اس بات کا قائل ہوں کہ زندگی کا جنسی پہلو سوانح نگار کے لئے بہت بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ بغیر اُس کے زندگی کا جذباتی رُخ روشنی میں نہیں آتا اور انسانی کردار کی قوت متحرکہ نظرانداز ہو جاتی ہے جیسا کہ "نقش اول" میں کہا جا چکا ہے۔ میرا گمان تو یہ ہے کہ جس طرح شراب کے نشہ کی حالت میں انسان کے اندرونی جذبات اور طبیعت کا پوشیدہ عیب وصواب باہر آجاتا ہے اسی طرح عشق مجازی کی طوفانی کیفیت بھی شخصی سیرت کے حقائق کو پردے کے

باہر لے آتی ہے۔ مولانا اگر اپنے عشق مجازی کے اس اشارے سے ایک قدم بھی آگے بڑھتے تو مجھے اُن کی نفسیات کے مطالعہ کا ایک بہترین میدان ملتا۔ لیکن بہرحال یہ تو صاف ظاہر ہے کہ مولانا کی انفرادیت عشق مجازی کے طوفان سے بھی سرفراز نکلی اور اس نے ہوس کی راہ کو بھی حقیقت کی طرف موڑ دیا۔ اس عمل میں بھی جسے مولانا لطف غیبی سے منسوب فرماتے ہیں اُن کی اپنی انفرادیت نمایاں ہے۔ درحقیقت "لطف غیبی" اُسی انفرادیت اور "انفرادیت" اُسی لُطف غیبی کا نام ہے!! ایک موقعہ پر ان ہی صفحات میں جب وہ اپنے عشق مجازی کا ذکر فرماتے ہیں تو اپنی نفسیاتی کیفیت کو اس طرح کھول دیتے ہیں کہ

"قبل اس کے کہ ہم پر شہادت دی جائے بہتر ہے کہ
ہم آپ ہی اپنے لئے شاہد بن جائیں"

غبارِ خاطر، تذکرہ، الہلال اور متعدد تحریروں میں ہم نے مولانا کو خود ہی اپنا شاہد بنتے دیکھا ہے اور اُن کے تشخص کے اسی متواتر جلوہ میں اور زیادہ اُن کی انفرادیت کو پہنچانا ہے۔

مولانا اپنی انفرادیت کی کم آمیزی کو اپنے "میکدہ خلوت" سے منسوب فرماتے جو اُنہیں بہت عزیز ہے اُن کے لئے "زندگی کی ساری رونقیں اسی میکدہ خلوت کے دم سے ہیں — یہ اجڑا اور ساری دنیا اجڑ گئی"

باہر کے سارے ساز و سامان عشرت مجھ سے چھن جائیں
لیکن جب تک یہ (میکدۂ خلوت) نہیں چھنتا میرے
عیش و طرب کی سرمستیاں کون چھین سکتا ہے۔"

۶

لیکن خلوت پسندیوں کی ان تمام سرمستیوں میں افسردگی اور درد و گداز کی بھی ایک جھلک نظر آتی ہے۔ جس کا ہمیں مولانا کی زندگی کے معیار پر تجزیہ کرنا ہے۔ ایک طرف تو احمد نگر کے محبس میں مولانا کا استغنا یہ ہے کہ :۔

"زندگی کی مشغولیتوں کا وہ تمام سامان جو اپنے وجود کے باہر تھا اگر چھن گیا ہے تو کیا مضائقہ ؟ وہ تمام سامان جو اپنے اندر تھا اور جسے کوئی چھین نہیں سکتا سینہ میں چھپائے ساتھ لایا ہوں۔ اُسے سجاتا ہوں اور اُس کے سیر و نظارہ میں محو رہتا ہوں۔"

لیکن دوسری طرف ہم سوچتے ہیں کہ کیا اسی سیر و نظارہ کی خلوت زندگی کے بیش یا افتادہ حقائق کی کسی کسوٹی پر پوری اتر سکتی ہے؟ کیا عوامی مفاد کے نقطہ نظر سے ہم سیر و نظارہ کی اس خلوت میں

افسردگی بے عملی اور قوت عمل کی شکست کا بھی کوئی پہلو پاتے ہیں؛ مولانا کی ذہنی رفعت اس قسم کی تمام کسوٹیوں سے بے پرواہ ہے۔ لیکن عوام کے ساتھ مولانا کی پبلک زندگی کے روابط تقریباً ۳۵ سال کی وسعت میں پھیلے ہوئے ہیں! اور خصوصاً اب جبکہ تقسیم شدہ ہندستان میں ۴½ کروڑ مسلمانوں کے واحد رہنما مولانا ہی ہیں اور عوام سے مولانا کا یہ تعلق اُن کے لٹریچر کا ایک نمایاں جزو بن چکا ہے تو پھر عوام کو اپنی استعداد کے مطابق مولانا کی زندگی کے اس پہلو پر تبصرہ کرنے سے کون روک سکے ؟ مولانا کے لئے اب ایک بڑی کشمکش یہ ہے کہ ادھر تو عوام اُن سے اپنا رشتہ توڑنا نہیں چاہتے ہیں اور نہ توڑ سکتے ہیں اور اُدھر مولانا اپنی خلوت میں ان عوامی جلوتوں کی مداخلت پسند نہیں کرتے۔ تاہم مجھے یقین ہے کہ باوجود اس تمام خلوت کوشی کے مولانا خود بھی یہ احساس رکھتے ہیں کہ وہ عوامی زندگی سے کتنے ہی بیزار ہوں لیکن یہ کام بھی بہت سے دوسرے ناخوش گوار مشاغل کی طرح اُنھیں کرنا ہی ہے۔

یکسانی اور تبدیلی کے فلسفہ پر بحث کرتے ہوئے مولانا فرماتے ہیں کہ "یہاں پانے کا مزا اُن ہی کو مل سکتا ہے جو کھونا جانتے ہیں، جنہوں نے کچھ کھویا ہی نہو انھیں کیا معلوم کہ پانے کے کیا معنے ہوتے ہیں"۔ لیکن جس طرح ذہنی زندگی میں پانے اور کھونے کی اصطلاحیں ایک خاص معنی رکھتی ہیں اسی طرح عوامی زندگی میں بھی سود و زیاں کا

حساب ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ عوامی زندگی کی جلوت میں جو ایک "عقلیت" کے سیر و تماشا کی خلوت نہیں ہے، کس کا زیاں کس کا سود ہے اور اس جلوت میں جہاں مولانا اکثر بادل نخواستہ آتے ہیں عوام کے سود میں اُن کی بخشش کا حصہ کتنا ہے۔ مولانا اپنی ذہنی زندگی میں اپنے زیاں کو اپنا سود سمجھتے ہیں! اور اُس معیار کے مطابق اُن کا یہ نقطہ نظر صحیح ہے۔ لیکن عوام جو مولانا کی ذہنی زندگی کی سطح سے بہت نیچے ہیں اپنے سود و زیاں کے تقابل کا مختلف معیار رکھتے ہیں اور اس لئے یہ کہہ سکتے ہیں کہ مولانا کی اعلیٰ ذہنی اور اخلاقی اور وجدانی صلاحیتوں نے جو کچھ انہیں دیا ہے اُس سے بہت زیادہ انھیں ملنا چاہیئے تھا۔ کیا ہم مولانا کی نفسیات کے مطالعہ میں کوئی ایسی حقیقت پا سکتے ہیں جو مولانا کے فلسفہ زندگی میں عوام کیلئے ایک حد سے زیادہ کوئی گنجائش پیدا کر سکی ہو!

مولانا کی تحریروں میں جہاں کہیں سوز و گداز کا کوئی پہلو نمایاں ہو گیا ہے (حالانکہ وہ اس پہلو کا زیادہ نمایاں ہونا پسند نہیں فرماتے) تو پڑھنے والوں کا ذہن اس جستجو کی طرف منتقل ہوتا ہے کہ کیا علاوہ فطری وجدان قلب کے جو لازماً سوز و گداز پیدا کرتا ہے عملی دنیا کے کچھ اسباب بھی ایسے بھی ہیں جنہوں نے مولانا کے افکار میں مایوسی اور شکست کا ایک عنصر پیدا کر دیا ہے۔ ایک مقام پر اپنی ذہنی زندگی کے سوز و گداز کو اس شاعرانہ انداز میں واضح

فرماتے ہیں :-

جب لوگ کامجوئیوں اور خوش وقتیوں کے پھول
چُن رہے تھے تو ہمارے حصہ میں تمناؤں اور
حسرتوں کے کانٹے آئے۔ اُنہوں نے پھول چُن
لئے اور کانٹے چھوڑ دئے۔ ہم نے کانٹے چن لئے
اور پھول چھوڑ دیئے۔

پھر اسی کیفیت کی تعلیل اپنے فلسفیانہ انداز میں اسطرح کرتے ہیں
کہ :-

اس بارگاہِ سود و زیاں کی کوئی عشرت نہیں جو کسی
حسرت سے پیوستہ نہ ہو۔ یہاں زلال صافی کا کوئی
جام نہیں بھرا گیا جو دُرد کدورت اپنی تہ میں
نہ رکھتا ہو۔ بادہ کامرانی کے تعاقب میں ہمیشہ
خمار ناکامی لگا رہا اور خندہ بہار کے پیچھے ہمیشہ گریہ
خزاں کا شیون برپا ہوا۔

لیکن عوامی زندگی کی پست سطح پر زندگی کے سود و زیاں کا یہ فلسفیانہ اور حکیمانہ تقابل تسکین بخش نہیں ہوتا۔ حقیقت یہ ہے کہ تنہائی، افسردگی اور کم آمیزی اور ذہنی خلوت مولانا کی فطرت کے یہ تمام اجزا ایسے ہیں کہ اگر اُن کو بیش یا افتادہ اسباب و علل کی کسوٹی پر کسا جائے تو ہم افسردگی اور کم آمیزی کا ایک ایسا پس منظر مولانا کی ذہنی زندگی

کے پیچھے دیکھتے ہیں جس کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ مولانا کی عوامی اور سیاسی زندگی کا آغاز کار ہی دوسروں کے طرز فکر سے جدا تھا۔ وہ اپنی تحریروں اور تقریروں میں بار بار اس حقیقت پر زور دیتے رہے ہیں کہ اُن کا راستہ دوسروں سے پہلے بھی الگ تھا اور اب بھی الگ ہے۔ ۱۹۲۰ء میں بنگال کی خلافت کانفرنس میں مولانا نے جو خطبہ صدارت پڑھا اُس میں اپنی اس ذہنی "غریب الوطنی" کا شکوہ اُن لوگوں سے کیا جو اُنکی راہ پر اُن کے ہم سفر نہ ہوسکے۔

فرماتے ہیں :-

میری طرف دیکھو میں ایک انسان تم میں موجود ہوں جو سالہا سال سے صرف ایک ہی صدائے دعوت بلند کرتا رہا۔ میں صرف ایک ہی بات کی طرف تڑپ تڑپ کر پکار رہا ہوں اور لوٹ لوٹ کر بلا رہا ہوں . . . . . . تم نے ہمیشہ اعراض کیا بلکہ غفلت و انکار کی ساری سنتیں تازہ کر دیں، افسوس تم میں کوئی نہیں جو میری زبان سمجھتا ہو، تم میں کوئی نہیں جو میرا شناسا ہو۔ میں سچ سچ کہتا ہوں کہ تمہارے اس پورے ملک میں میں ایک بے یار و آشنا غریب الوطن ہوں . . . . . .

باوجود کارکن رفیقوں کی موجودگی کے مجھے

اپنی راہ میں صحرا کے درخت کی طرح بے مونس و
رفیق اور صرف اپنے سایہ ہی پر قانع رہنا پڑا۔
یہ عالم جو اپنے ہر گوشہ میں معیتوں اور رفاقتوں
کے راحت افزا جلووں سے معمور ہے میرے لئے ہمیشہ
ایک سمندر یا صحرائے ریگ زار رہا۔ کبھی اس نے
ایک آبادی اور بستی کا کام نہیں دیا اور نہ کبھی
میں اپنے تئیں اس قابل بنا سکا کہ اس کی رفاقتوں
کا ساتھ دے سکوں۔
کے نااہلوں کی حالت کا اس طرح شکوہ فرماتے ہیں کہ
دوسری طرف کام کرنے والوں کی جماعت ہے
اور جس جس پہلو سے دیکھتا ہوں اس پر اب تک
وہی تذبذب و اضطراب اور تزلزل و انتشار کا عالم
طاری نظر آتا ہے جو پچھلے دوروں میں طاری رہ
چکا ہے۔ اب تک مقاصد سے اعراض ہے اور
وسائل میں انہماک۔ اب تک حقیقی مصلحت بینی
اور حیلہ جوئی اور بہانہ سازی میں امتیاز کی راہ
مسدود ہے اور عزم و یقین کی جگہ ظن و شک اور
خوف و ہراس کی حکومت قائم ہے۔ زبانوں کی
لکنت دور ہو چکی اور شاید چہروں کا ہراس بھی

جاتا رہا لیکن دلوں کی وحشت بدستور باقی ہے اور ایمان کی کمزوری نے اب تک روحوں کا ساتھ نہیں چھوڑا۔

پھر فرماتے ہیں :-

راہ عمل کے لئے تمہارا رُخ وہ ہے جس کی طرف تم دوڑ رہے ہو اور مری راہ وہ ہے جس کی طرف پچھلے صفحوں میں بلا چکا ہوں۔ تم بارش کے وجود سے انکار نہیں کرتے لیکن منتظر رہتے ہو کہ پانی برسنے لگ جائے تو اقرار کریں۔ لیکن میں ہواؤں میں پانی کی بُو سونگھ لینے کا عادی ہوں اور صرف بادلوں ہی کا دیکھ لینا میرے علم کے لئے کافی ہوتا ہے۔ پس اگر پچھلا تجربہ بس کرتا ہے تو اس سے عبرت پکڑو اور اگر ابھی اور انتظار کرنا چاہتے ہو تو انتظار کر دیکھو۔

عوام کو تنبیہہ فرماتے ہیں :-

آہ! تمہاری غفلت سے بڑھ کر آج تک کوئی اچنبھے کی بات نہ ہوئی اور تمہاری نیند کی سنگینی کے آگے پتھروں کے دل چھوٹ گئے۔ میں کیا کروں اور کہاں جاؤں اور کس طرح تمہارے دلوں کے اندر

اُتر جاؤں اور یہ کس طرح ہو کہ تمہاری روحیں
پلٹ جائیں اور تمہاری غفلت مر جائے ۔ یہ کیا ہو گیا
کہ پاگلوں سے بھی بدتر ہو گئے ہو اور کیوں تمہاری
عقلوں پر ایسا طاعون چھا گیا ہے کہ سب کچھ کہتے ہو
اور سمجھتے ہو پر نہ تو راست بازی کی راہ تمہارے آگے
کھلتی ہے اور نہ گمراہوں کے نقشِ قدم چھوڑتے ہو۔

یہ سب کچھ مولانا اس زمانہ میں فرما رہے تھے جب خلافت تحریک زور پکڑ چکی تھی اور ہر طرف جوش و خروش کا اظہار کیا جا رہا تھا ۔ لیکن مولانا مطمئن نہ تھے ، اس لئے کہ وہ جس پیمانہ سے قومی تحریک کو ناپتے تھے وہ اُن کے رفیقوں اور شرکائے کار کا پیمانہ نہ تھا ۔ اسی لئے وہ مایوس ہوتے تھے اور اپنی مایوسیوں کو اپنی خطابت کے مخصوص رنگ میں ظاہر فرماتے تھے ۔

اس خطبہ صدارت کے آخری صفحات میں مولانا نے اپنی خطابت کے تمام زور کو عوام کے متعلق اپنی مایوسی کے اظہار میں صرف کر دیا ۔ اِن الفاظ میں مولانا کی فطرت کے بہت سے پہلو نمایاں ہیں :-

بہت کم روحیں ایسی نکلیں جن کو حقیقت کا فہم ہو
اور بہت کم دل ایسے ملے جو طلب و عشق سے معمور
ہوں ۔ یہاں تک کہ میں تمہاری آبادیوں سے الگ

ہو کر رانچی کے گوشہ قید و بند میں چلا گیا اور خدا
ہی بہتر جانتا ہے کہ وہاں بھی میری صبحیں اور میری
شامیں کن فکروں اور کن کاموں میں بسر ہوتی رہیں
اب میں پھر تم میں واپس آگیا ہوں لیکن تمہاری
بھیڑوں اور غولوں میں سچی جستجو کا چہرہ اسی طرح
مفقود ہے جیسا کہ ہمیشہ سے مفقود رہا ہے۔ اب تک
حقیقت شناسی کی کوئی گہرائی تم میں نظر نہیں آتی
تم مجھے بلاتے ہو کہ استقبال سے بھرے ہوئے
اسٹیشنوں پر مجھے اتارو اور ایسے پرجوش
انسانوں کے نعرے سناؤ جن کے ہاتھوں میں
فتمند فوجوں کی طرح جھنڈیاں ہوں اور پھر تم
اتنے انسان میری گاڑی کے چاروں طرف اکٹھے
کردو کہ اُن کے ہجوم میں دو چار آدمیوں کا خون
ہو جائے۔ مگر آہ! میں تمہاری اِن بھیڑوں کو لیکر
کیا کروں جب تمہارے دلوں میں سناٹا چھایا ہوا
ہے اور تمہارے اس جوشِ استقبال سے مجھے کیا
خوشی ہو جب تمہاری روحیں موت کی افسردگی سے
مرجھائی ہوئی ہوں۔

آخری سطروں میں وہ اپنے دل کے درد کی پکار کو اس

طرح جگہ دیتے ہیں :-

افسوس تم میں کوئی نہیں جو میرا آشنا سا ہو۔
میں سچ سچ کہتا ہوں کہ تمہارے اس پورے ملک
میں میں ایک بے یار و آشنا غریب الوطن ہوں۔

من بہر جمعیتے نالاں شدم — جفت خوشحالاں و بدحالاں شدم
ہر کسے از ظن خود شد یار من — وز درون من نجست اسرار من
سرِّ من از نالۂ من دور نیست — لیک کس را گوش آں منظور نیست

اس کے بعد وہ یاد دلاتے ہیں کہ وہ جو کچھ کہتے رہے اُس سے اکثروں نے اعراض کیا اور بہتوں نے اُس پر استہزا کیا اور بعضوں نے اُسے ادعیانہ فسونگری قرار دیا۔ لیکن پھر رفتہ رفتہ سب اُسی حقیقت کے قایل ہونے لگے۔

یہ تو ۱۹۲۰ء کے تاثرات ہیں، لیکن آغاز کار کے احساسات کا بھی کم و بیش یہی عالم تھا۔ الہلال (۱۹۱۳ء) میں مولانا عوام کو مخاطب کرتے ہیں :-

میں وہ صور کہاں سے لاؤں جس کی آواز چالیس کروڑ
دلوں کو خواب غفلت سے بیدار کر دے۔ میں اپنے
ہاتھوں میں وہ قوت کیسے پیدا کروں کہ اُن کی سینہ کوبی
کے شور سے سرگشتگان خواب موت ہشیار
ہو جائیں! آہ کہاں ہیں وہ آنکھیں جنکو دردِ ملت

میں خونباری کا دعویٰ ہے، کہاں ہیں وہ دل جن کو زوال امت کے زخموں پر ناز ہے، کہاں ہیں وہ جگر جو آتش غیرت و حمیت کی سوزش کے لذت آشنا ہوں۔ اور پھر آہ کہاں ہیں اس برہم شدہ انجمن کے ماتم گسار اس برباد شدہ قافلہ کے نالہ ساز، اس صف ماتم کے فغانِ سنج اور اس کشتی طوفانی کے مایوس مسافر جن کی موت و حیات کے آخری لمحے جلد جلد گذر رہے ہیں اور وہ بے خبر ہیں یا خاموش۔ روتے ہیں یا مایوسی سے چپ و راست نگراں، مگر نہ اُن کے ہاتھوں میں اضطراب ہے نہ پاؤں میں حرکت، نہ ہمتوں میں اقدام نہ ارادوں میں عمل کا ولولہ۔ دشمن شہر کے دروازوں کو توڑ رہے ہیں اور اہل شہر رونے میں مصروف ہیں۔ ڈاکوؤں نے قفل توڑ دئے ہیں اور گھر والے سوتے ہیں

الہلال ہی کی اشاعت کے ایک افتتاحیہ میں فرماتے ہیں کہ

افسوس اس دور جوش و خروش اور بیداری و ہشیاری میں بھی دیکھتا ہوں تو میرے دل کی غمگینی و اضطراب کا علاج کہیں نظر نہیں آتا۔ میں دیکھتا ہوں کہ یا تو غفلت کی سرشاریاں ہیں یا اگر بیداری کی کروٹیں

بھی لی ہیں تو آنکھوں سے غفلت دوشیں کا خمار ابھی
دور نہیں ہوا ہے۔ خواب غفلت کی سرشاری
اور چشم نیم باز کی کرد ٹیں یہ تو دو پہلی حالتیں ہیں۔
لیکن ان کے بعد ایک تیسرا گروہ بھی نظر آتا ہے
جو لبستر سے تو اُٹھ چکا ہے مگر منزل مقصود کے نشان
سے بے خبر ہے۔

مجھے تو اردو ادب میں کوئی دوسرا ادیب ایسا نظر نہیں آتا جس نے اس شدت کے ساتھ اپنی انفرادیت کے تازیانے عوام کی ذہنیت پر مارے ہوں یا جس کے افکار کے پیمانہ میں عوام کا جمود اس قدر مایوس کن ثابت ہوا ہو۔ یا جس کا احساس عوام کے جمود سے اسقدر زیادہ مجروح ہوا ہو۔ جذبہ صادق کے ان مظاہروں کی قوت سے انکار نہیں لیکن مولانا کی مایوسیوں کا ایک اور سبب بھی ہو سکتا ہے اور وہ یہ کہ امام کا منبر مقتدیوں کی سطح سے بہت اونچا ہے۔ ادیب وخطیب نے جس اونچے مینار پر کھڑے ہوکر نیچے میدان کے اس ہجوم پر نظر کی اس کے افراد بلندی کی وجہ سے بہت چھوٹے نظر آئے۔ اور یہ بلندی عوام کے افکار کی پستی تک نہ پہنچ سکی اور پہنچ بھی نہ سکتی تھی۔ اس طرح یہ گمان بھی کسی حد تک حقائق سے غیر متوازن نہیں کہ مولانا کی انفرادیت نے جو اُن کی "جی پی ایس" کا خاصہ ہے اُنہیں عوامی زندگی سے زیادہ قریب

کبھی نہ ہونے دیا۔ ان کے ذہنی اور وجدانی خلوت خانے کے دروازے عوام کے لئے کبھی پوری طرح نہ کھل سکے۔ مختصر یہ کہ جو چیز مولانا کی جی بی ایس کا طرۂ امتیاز ہے وہی اُن کی زبان اور اُن کے قلم سے ایک غمگین راگ بن کر نکلتی ہے۔

نفسیات کی اس بحث کا ایک پہلو اور بھی ہے۔ بار بار مولانا اس بات کا شکوہ کرتے رہے ہیں کہ اُن کے رفیقوں اور شرکائے کار نے صحیح راہ عمل جس کی طرف وہ دعوت دیتے رہے اختیار نہیں کی۔ یہ بحث اس وقت ہمارے موضوع سے خارج ہے کہ وہ راہ عمل کیا تھی جو مولانا پیش کر رہے تھے لیکن بر سبیل تذکرہ اتنا تو کہا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں کی حد تک مولانا نے جو راستہ اُنہیں بتایا اُس کو مسلمانوں نے اختیار نہیں کیا اور بالآخر اس کے ہولناک نتائج اُنہیں برداشت کرنے پڑے۔ تب ہی دنیا نے سمجھا کہ مولانا کتنا صحیح راستہ بتا رہے تھے اور ہندوستان کے مسلمان کیسے غلط راستہ پر اصرار کر رہے تھے مولانا کے ادب کا گہرا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ جو لوگ مولانا کے مخاطب تھے اُن کے متعلق مولانا کی مایوسی بیجا نہ تھی۔ مولانا کو اپنی زندگی میں رفیقوں اور دوستوں کی تائید سے استقدر محرومی رہی اور مخالفوں کی مخالفت کا استقدر سامنا کرنا پڑا کہ اس حالت کے اثر نے اُن کی خلوت پسند طبیعت کو اور بھی زیادہ خلوت پسند

اور کم آمیز بنا دیا۔ اُن کی زندگی کے آغاز میں مولانا کے مزاج کی خصوصیات
کو سمجھنے اور اُن کی قدر کرنے والے چند ہی آدمی تھے اور ان میں بھی
سب سے زیادہ ممتاز علامہ شبلی مرحوم تھے۔ پھر جب مولانا نے
ایک وسیع تر پبلک اور سیاسی زندگی کے دائرے میں قدم رکھا تو
اس میدان میں اُن کی خطابت اور "جی نی الیس" اور علم و فضل
سے مرعوب و متاثر ہونے والے تو بہت تھے لیکن اُن کی بات
کو سمجھنے والے کم تھے۔ شروع ہی سے مولانا کے اور مولانا محمد علی
مرحوم اور اُن کی جماعت کے درمیان اشتراک افکار کی راہیں بند رہیں
یہ کوئی راز نہیں ہے کہ نہ تو مولانا علی برادران کے طرز تفکر سے قریب
آسکے اور نہ علی برادران کبھی مولانا کی خلوت افکار کے کسی گوشہ
سے آشنا ہو سکے۔ یہ زمانہ وہ تھا کہ علی برادران قومی جد و جہد
کے میدان میں نمایاں ہونے لگے تھے اور یہی زمانہ وہ تھا جب مولانا
کی آواز الہلال کے ذریعہ سے تمام ملک میں گونجنے لگی تھی۔ مگر
ان دونوں کے ذہنی تصادم کے کافی اسباب موجود تھے۔ یہ تصادم
بظاہر تو کبھی زیادہ تلخ نہیں ہوا (سوائے مسلم یونیورسٹی کے مسئلہ
کے جس کا "نقش اول" میں ذکر آچکا ہے اور بعد میں بھی ذکر آئیگا)
لیکن اندرونی طور پر اسقدر زیادہ تھا کہ کبھی ان دونوں کے طرز فکر
میں کوئی نقطۂ اتصال پیدا ہی نہ ہو سکا۔ خلافت کی تحریک میں مولانا نے
وہی اور اتنا ہی بلکہ اس سے زیادہ کام کیا جو علی برادران کر رہے تھے

دوسری قومی تحریکوں میں بھی مولانا ایک ہی میدان میں علی برادران کی جماعت کے ساتھ کام کرتے رہے، لیکن افکار اور اصولوں کا معنوی اختلاف سطح کے نیچے بہت مستحکم تھا۔ اس حقیقت سے وہ لوگ خوب واقف ہیں جنھوں نے مسلمانوں کی اس جدوجہد کا زمانہ دیکھا ہے اور پھر یہ اختلاف اُس وقت تو بالکل عیاں ہوگیا جب تحریک خلافت کے ختم ہونے اور فرقہ پرستی کے فتنے کا سر اٹھنے کے بعد علی برادران، مہاتما گاندھی کی قومی تحریک سے جدا ہوئے۔ لیکن مولانا نے اُس تحریک کا دامن ہاتھ سے نہ دیا، حتیٰ کہ وہ اپنی جگہ تقریباً تنہا رہ گئے، لیکن جو راہ انہوں نے پہلے دن سے اختیار کی تھی اُس کے صحیح ہونے کا عقیدہ اُن کے دل میں ایک لمحہ کیلئے بھی کمزور نہ ہوسکا۔

میری طرح جو لوگ تحریک خلافت کے زمانہ میں مولانا اور مولانا محمد علی دونوں کو قریب سے دیکھ رہے تھے وہ سمجھ گئے کہ ان دونوں کے درمیان ایک ایسی ذہنی خلیج حائل ہے جس پر کوئی پل نہیں باندھا جاسکتا۔ مولوی ابوسعید بزمی صاحب نے اپنی ایک کتاب میں اس واقعہ کا ذکر کیا ہے کہ مولانا محمد علی اکثر مولانا کو "ضدی مولوی" کے نام سے یاد کیا کرتے تھے۔ میں سوچتا ہوں تو مولانا کی "ضد" کے مسلک ہی میں اُن کی شخصیت کا اصلی استحکام نظر آتا ہے۔ مولانا محمد علی اور مولانا کی انفرادیت میں بھی

ایک بہت بڑا فرق تھا۔ مولانا محمد علی ایک عمومی لیڈر رہے اور ایک عمومی لیڈر کی طرح اپنے بادبانوں کا زاویہ ہوا کے رُخ پر قائم کر سکتے تھے۔ مولانا اس مفہوم اور انداز کی عمومیت سے تقریباً بیگانہ رہے۔ اُن کی انفرادیت کے دائرہ میں سب سے نمایاں عنصر عوام کی مقبولیت نہ تھی۔ بلکہ خود اُن کی انفرادیت بجائے خود تھی۔ مولانا محمد علی بسا اوقات اپنے نقاد اور مخالف سے دست و گریباں ہو جانے کی جرات رکھتے تھے اور ضرورت کے وقت اُن کی صحافت کا انداز بھی جارحانہ ہو سکتا تھا، لیکن مولانا بعض اوقات دوسروں پر اس لئے تنقید یا تعریض نہ کرتے تھے کہ ایسا کرنا اپنی توہین سمجھتے تھے۔ یہ کوئی احساس کمتری نہیں بلکہ ایک بہت ضدی اور مستحکم انفرادیت ہے جو میدان جنگ میں اس لئے نہیں جاتی کہ اُسے کوئی برابر کا حریف نظر نہیں آتا!

مگر اس "انانیت" میں غمگینی مایوسی اور محرومی کی جو علامتیں ہم پاتے ہیں اس کا سبب وہی ایک ہے جس کا میں ذکر کر چکا ہوں یعنی یہ کہ مولانا کو اپنی زندگی میں بہت ہی کم رفیق ہم مشرب اور ایسے لوگ مل سکے جو اُنہیں صحیح طور پر سمجھتے، لیکن مخالفوں کا ہجوم ہر طرف رہا۔ اول تو ابتدائی دور میں قدامت پرست علماء کی بعض جماعتیں بھی مولانا کی وسیع الخیالی سے آزردہ ہوئیں، اُس کے بعد قومی جد وجہد کے میدان میں مولانا محمد علی کی جماعت سے ذہنی اختلافات رہے۔ پھر جب تحریک خلافت ختم ہوئی اور علی برادران کی قیادت کا دور ختم ہوا تو محمد علی جناح میدان میں آئے۔ اُن کی تحریک کا طرۂ امتیاز یہ بھی

تھا کہ اختلاف رائے کو معاف نہ کیا جائے۔ مولانا ہمیشہ سب سے زیادہ اُن حملوں کی زد میں رہے جو لیگ سے اختلاف رکھنے والے مسلمانوں پر کئے جاتے تھے۔ اِن سیاسی تعصبات کے سلسلہ میں جو مولانا کے خلاف لیگی قیادت کے دور میں بھڑکائے گئے ان کی تفسیر قرآن بھی ہدف بنائی گئی جو دراصل مولانا کے علم وفضل کا ایک بڑا کارنامہ ہے۔ مولانا نے اس تفسیر میں دوسرے مذاہب اور اُن کے بنیادی عقائد کا احترام کرنے کی ضرورت پر بحث کی ہے اور اس بحث پر آیات قرآنی کو دلیل لائے ہیں۔ مخالفین نے اس موضوع پر مولانا کے خیالات کو تنقیص وتعریض کا ہدف بنایا اور اعتراضات کے پہاڑ کھڑے کر دئے حتیٰ کہ ترجمان القرآن کو کانگریسی تفسیر کے نام سے موسوم کیا جانے لگا۔ کلکتہ میں نماز عیدین کی امامت پر جو ہنگامہ برپا کیا گیا وہ تو ہر شخص کو یاد ہوگا۔ پھر جب کانگریس کی تحریک آزادی کے دوران میں خدا اور رسول کا نام لے کر مسلم لیگ کے نظریات کو جاہل مسلمانوں کے دلوں میں بٹھایا گیا اور ایک خودغرض اور نا عاقبت اندیش قیادت نے جہلاء کے جذبات کو اتنا گرم کر دیا کہ عقل وفہم کے تمام راستے بند ہو گئے تو اُس زمانہ میں مولانا کے ساتھ جو برتاؤ کیا گیا وہ بھی سب کو معلوم ہے۔ قائداعظم نے اُنہیں "شو بوائے" کا خطاب عطا فرمایا۔

پھر عام مسلمانوں کے اِشتعال کو اتنا تیز کیا گیا کہ مولانا کی جان بھی خطرہ میں پڑ گئی۔ جتنی گالیاں اُنہیں دی گئیں شاید ہی ہندستان

کے کسی دوسرے لیڈر کے حصہ میں آئی ہوں۔ لوگوں نے ہزاروں بہتان اُن کی ذات پر باندھے اور یہ سب ایک ایسا امتحان تھا جس سے **مولانا** اپنی پیشانی پر ایک شکن ڈالے بغیر گذر رہے۔ لیکن تعجب کیا ہے اگر انسانی احساسات اس تمام سب وشتم سے مجروح ہوئے ہوں اور اسی لئے اُن کی فطرت اُن کی انفرادیت کے پوشیدہ مرکز میں سمٹ کر پہلے سے زیادہ گوشہ نشین ہوگئی ہو۔ علاوہ بریں مولانا کی زندگی کے اس دور میں بھی جو سب سے زیادہ مصروف اور تعمیری دور تھا **مولانا** کو اپنے رنگ کے صرف دو ہی تین رفیق مل سکے۔ میں غور کرتا ہوں تو دو تین سے زیادہ ایسے نام نہیں بتا سکتا۔ مثلاً گذرے ہوئے دوستوں میں **مہاتما گاندھی**، **حکیم اجمل خاں** اور **سی، آر، داس** اور زندوں میں **پنڈت جواہر لال نہرو** اور **آصف علی**۔ کانگریس کے اندر ساری عمر گذار دینے کے باوجود **مولانا** کے رفیقوں اور ایسے لوگوں کی جو **مولانا** کے ساتھ حقیقی اشتراک افکار رکھتے تھے اگر کوئی فہرست مرتب کی جائے تو نمبر ایک اور دو اور تین کے بعد ہی شاید وہ گنتی ختم ہوجائے گی!!

یہ اُس پس منظر کا ایک خاکہ ہے جس سے **مولانا کی فطرت** میں مایوسی، بیزاری، خلوت پسندی، اور کم آمیزی کے عناصر کو تقویت حاصل ہوئی۔

غبار خاطر کے ایک مکتوب میں "شاخ بریدہ" کو ایک

مثال بناکر دنیا کے حالات سے اپنی افسردگی اور بے پروائی کا اس طرح اظہار فرماتے ہیں :۔

یہاں (قلعہ احمد نگر میں) احاطہ کے شمالی گوشہ میں ایک نیم کا درخت ہے ۔ کچھ دن ہوئے ایک وارڈر نے اُس کی ایک ٹہنی کاٹ ڈالی تھی اور جڑ کے پاس پھینک دی تھی ۔ اب بارش ہوئی تو تمام میدان سرسبز ہونے لگا ۔ شاخوں نے زرد چیتھڑے اُتار کر بہار و شادمانی کا نیا جوڑا پہن لیا ۔ جس ٹہنی کو دیکھو ہرے ہرے پتوں اور سفید پھولوں سے لدی ہوئی ہے لیکن اُس کٹی ہوئی ٹہنی کو دیکھیئے تو ویسی ہی سوکھی کی سوکھی پڑی ہے ۔ یہ بھی اُسی درخت کی ایک شاخ ہے جسے برسات نے آتے ہی زندگی اور شادمانی کا نیا جوڑا پہنا دیا ۔ یہ بھی آج دوسری ٹہنیوں کیطرح بہار کا استقبال کرتی مگر اُسے اب دنیا اور دنیا کے موسمی انقلابوں سے کوئی سروکار نہیں رہا بہار و خزاں ، گرمی و سردی ، خنکی و طراوت سب اُس کے لئے یکساں ہو گئے ۔ کل دوپہر کو اُس کی طرف سے گذر رہا تھا کہ یکایک اُس شاخ بریدہ سے پاؤں ٹکرا گیا ۔ میں رُک گیا اور اُسے دیکھنے لگا ۔

بے اختیار شاعر کی حسن تعلیل یاد آگئی۔

قطع امید کردہ نہ خواہد نعیم دہر
شاخ بریدہ را نظرے بر بہار نیست

آج سے تیس سال پہلے بھی جو مولانا کے ذہنی قویٰ شباب کی منزل تک پہونچ چکے تھے وہ اپنے اندر یہ احساس بہت قوی پاتے تھے کہ "کس زباں مرا نمی فہمد" تذکرہ کے اوراق پر انہوں نے اپنی اس حالت کا بار بار ذکر کیا ہے۔ مثلاً اپنے نام پر خود ہی تبصرہ فرماتے ہیں :-

والد مرحوم نے نام "فیروز بخت" رکھا تھا.....
... سبحان اللہ! بخت کی فیروزی اور طالع کی ارجمندی ۔ عمر لغزشوں اور ٹھوکروں کی پامالی میں بسر ہو چکی، اب جو شاید باقی ہے وہ دم لینے اور ستانے میں ختم ہو رہی ہے۔ نہ منزل مقصود کا پتہ نہ شاہراہِ منزل پر قدم........ جتنی زندگی گذر چکی منہ موڑ کر دیکھتا ہوں تو ایک نمود غبار سے زیادہ نہیں اور جو کچھ سامنے ہے وہ بھی جلوہ سراب سے زیادہ نظر نہیں آتا۔ اپنی سرگذشت اور روئیداد عمر لکھوں تو کیا لکھوں۔ ایک نمود غبار اور جلوہ سراب کی تاریخ حیات

قلمبند ہو تو کیونکر ہو۔ دریا میں حباب تیرتے ہیں، ہوا
میں غبار اُڑتے ہیں، طوفان نے درخت گرا دئے،
سیلاب نے عمارتیں بہادیں۔ عنکبوت نے اپنی
پوری زندگی تعمیر میں بسر کر دی۔ مرغ آشیاں پرست
نے کونے کونے سے چُن کر تنکے جمع کئے۔ خرمن و
برق کا معاملہ ہے، آتش و خس کا افسانہ۔ اِن سب
کی سرگذشتیں لکھی جاسکتی ہیں تو لکھ لیجے۔ میری
پوری سوانح عمری بھی ان ہی میں مل جائے گی۔
نصف افسانہ امید اور نصف ماتم یاس۔

اپنی ذہنی مشکلات اور معنوی کوائف کی طرف اشارہ فرماتے ہیں:

جس راہ میں قدم اُٹھایا زنجیروں اور کمندوں نے
استقبال کیا۔ جس گوشہ میں پناہ لی وہی زندانِ
ہوس و آگہی نکلا۔ ایک قید ہو تو اس کا ذکر کیجیے
ایک زنجیر ہو تو اُس کی کڑیاں گنیئے۔

اِن اوراق کو ترتیب دیتے وقت میں ہر ممکنہ کوشش اس بات کی کرتا رہا کہ جہاں کہیں مولانا نے اپنے متعلق کچھ فرمایا ہے اُس کو اکٹھا کرلوں۔ اس جستجو کے سلسلہ میں ابو سعید بزمی صاحب کا ایک کتابچہ بھی نظر سے گذرا جس کا ذکر پہلے آچکا ہے۔ کتابچہ کے مندراج کا عام رجحان تو زیادہ تر جذباتی مداحی کی طرف ہے لیکن کہیں کہیں مجھے

ام کی باتیں بھی مل گئیں۔ ایک مقام پر بزمی صاحب لکھتے ہیں کہ جب
نہوں نے مولانا سے کہا کہ عوام اُن کی جد و جہد سے پوری طرح
واقف نہیں تو

"میرے بھائی" مولانا نے بڑی بے نیازی سے کہا
"میں نے اس چیز کی کبھی آرزو نہیں کی کہ لوگ
میرے بارے میں کیا جانتے ہیں اور کیا نہیں
جانتے"

یہ وہی انداز بے نیازی جس کو میں نے مولانا کی انفرادیت اور انانیت سے منسوب کیا ہے۔ عوام کی خدمت کے میدان میں یہ انفرادیت کس حد تک کام آئی یا آسکتی ہے یہ ایک الگ بحث ہے لیکن اتنا تو کہہ سکتا ہوں کہ مولانا اگر ایک جی نی الیس (عبقری) ہیں ــــ اور بلاشبہ ہیں ــــ تو اس عبقریت سے پیدا ہونے والی انفرادیت نے اُنہیں عمومیت کے لازمی گرد و غبار سے ہمیشہ بیزار رکھا۔ باوجودیکہ وہ عوامی تحریکات کے رہنما کی حیثیت سے بارہا منظر عام پر آئے لیکن اُن کی عبقریت کا مطالعہ کرنے والا انہیں عوامی رہنما (بہ اصطلاح عام) تسلیم کرنے پر آمادہ نہیں ہو سکتا۔ اُن کی جی نی الیس نے اُنہیں ایک ایسی سطح پر پہنچا دیا ہے جہاں، خوشی اور ناخوشی، تسکین و اضطراب افکار اور اعمال اور کسی چیز میں بھی اُن کے اور عوام کے درمیان کوئی نقطۂ اشتراک موجود نہیں۔ وہ نہ تو اپنی امیدوں میں اور نہ اپنی

مایوسیوں میں عوامی افکار کو شریک کر سکتے ہیں۔ مولانا کی نفسیات میں عمومی زندگی سے جو بُعد اور راہ و رسم دنیا سے جو بیزاری نظر آتی ہے اُسے میں ایک قسم کا " احساس شکست" Frustration کہتا اگر یہ نہ سمجھتا کہ اس اصطلاح کے غلط اور میرے مفہوم سے جدا اور مولانا کے لئے توہین آمیز معنی بھی لئے جا سکتے ہیں۔



مولانا کے عزم وعزیمت کا بھی ایک خاص انداز ہے۔ اُنہوں نے اپنی عمومی زندگی میں دو چار دفعہ سے زیادہ کبھی کسی اختلاف خیال کو بر سر عام ظاہر کرنا یا کسی اختلاف کرنے والی جماعت پر علانیہ تنقید کرنا اپنے لئے جائز اور اپنے علمی وقار کے شایان شان نہیں سمجھا۔ کانگریس کے داخلہ کونسل، اصلاح ندوۃ العلماء، مجوزہ مسلم یونیورسٹی، شیعہ کالج اور دو چار ایسے ہی موضوعات کے علاوہ اُنہوں نے عام طور پر نہ تو الہلال کے صفحات پر اور نہ پبلک پلیٹ فارم پر تنقید اور اعتراض کو روا رکھا۔ رائے اور خیالات کو وہ ایک ایسی بلندی سے دیکھتے رہے اور عام مباحث میں اُلجھنے کو اُنہوں نے اپنے شخصی وقار کے اس قدر مغایر

سمجھا کہ ایسے مسائل میں افکار اور تصورات کا ضبط اور ایک سنجیدہ خاموشی اُن کے علم و فضل کی ایک ضروری شرط قرار پائی۔

جب کبھی اُنہوں نے اپنی زندگی کے اس مسلک کا ذکر کیا تو کچھ اس طرح کہ اُن کے اور دوسروں کے درمیان وجہ امتیاز واضح ہو جائے عام الفاظ میں بغیر کسی شخصی تخصیص کے اُنہوں نے دوسروں کے مسلک پر نکتہ چینی بھی کی لیکن صرف اسی طرح کہ پڑھنے والا دوسروں کو اُن کا مدمقابل تصور نہ کر لے۔ اپنی شخصی زندگی کے ایک معمولی پہلو کی طرف بھی اس شان کے ساتھ اشارہ فرماتے ہیں کہ

در اصل صرف گرمی ہی کے لئے آتشدان کا شیدائی نہیں ہوں۔ جب تک شعلے بھڑکتے نظر نہ آئیں پیاس نہیں بجھتی بے دردوں کو جو دل کی جگہ برف کی سل سینہ میں چھپائے پھرتے ہیں اِن معاملات کی کیا خبر؟

سیاسی زندگی میں جب مولانا فرقہ پرست مسلمانوں کے پُرخروش حلقوں میں ہدف ملامت بنے ہوئے تھے۔ وہ یکساں سنجیدگی اور متانت کے ساتھ اس آندھی کے تمام جھونکوں کا مقابلہ کرتے رہے۔ مارچ ۱۹۴۰ء میں رام گڈھ کی کانگریس میں اُنہوں نے اپنے مسلک کے متعلق جو بات صاف صاف کہی وہ اُن کے کیرکٹر کا بالکل صحیح عکس ہے اُنہوں نے فرمایا:-

میں اپنے ہم مذہبوں کو یاد دلاؤں گا کہ میں نے ۱۹۱۲ء

میں جس جگہ سے اُنہیں مخاطب کیا تھا آج بھی میں
اُسی جگہ کھڑا ہوں۔ اس تمام مدت نے حالات کا جو
انبار ہمارے سامنے کھڑا کر دیا ہے ان میں کوئی حالت
ایسی نہیں جو میرے سامنے سے نہ گذری ہو۔ میری آنکھوں
نے دیکھنے میں اور میرے دماغ نے سوچنے میں
کبھی کوتاہی نہیں کی۔ حالات میرے سامنے سے گذرتے
ہی نہ رہے بلکہ میں اُن کے اندر کھڑا رہا اور میں نے
ایک ایک حالت کا جائزہ لیا۔ میں مجبور ہوں کہ اپنے
مشاہدے کو نہ جھٹلاؤں۔ میرے لئے ممکن نہیں کہ
اپنے یقین سے لڑوں، میں اپنے ضمیر کی آواز کو نہیں
دبا سکتا۔ میں اس تمام عرصہ میں اُن سے کہتا رہا ہوں
اور آج بھی اُن سے کہتا ہوں کہ ہندستان کے ۹ کروڑ
مسلمانوں کے لئے صرف وہی ایک راہِ عمل ہو سکتی ہے
جس کی میں نے ۱۲ء میں اُنہیں دعوت دی تھی۔

میرے جن ہم مذہبوں نے ۱۲ء میں میری
صداؤں کو قبول کیا تھا مگر آج مجھ سے اختلاف ہے میں
اُنہیں اس اختلاف کے لئے ملامت نہیں کروں گا۔
...... مگر ہمیں زندگی کی ٹھوس حقیقتوں کی بناء پر
اپنے فیصلوں کی دیواریں تعمیر کرنی ہیں ......

ایسے ہندو دماغ ہیں جو چاہتے ہیں کہ ایک ہزار برس پہلے کی ہندو زندگی واپس لائیں تو انہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ وہ ایک خواب دیکھ رہے ہیں اور وہ کبھی پورا ہونے والا نہیں ۔ اسی طرح اگر ایسے مسلمان دماغ موجود ہیں جو چاہتے ہیں کہ اپنی گذری ہوئی تہذیب و معاشرت کو پھر تازہ کریں جو وہ ایک ہزار برس پہلے ایران اور وسط ایشیا سے لائے تھے تو میں اُن سے بھی کہوں گا کہ وہ اس خواب سے جس قدر جلد بیدار ہو جائیں بہتر ہے کیونکہ یہ غیر قدرتی تخیل ہے اور حقیقت کی سرزمین میں ایسے خیالات اُگ نہیں سکتے ۔ . .

. . . .

جس زمانہ میں آج سے آٹھ سال پہلے **مولانا** نے کانگریس کے پلیٹ فارم پر یہ بات صاف صاف کہی تھی یہ وہ زمانہ تھا جب فرقہ پرستی کا خونخوار دیو اپنی پوری طاقت کو سمیٹ کر قوم پرستی پر حملے کر رہا تھا ۔ اور خود کانگریس کے بعض گوشوں میں فرقہ پرستی اور رجعت پسندی اور احیائے ماضی Revivalism کے جراثیم متحرک ہو رہے تھے ۔ باوجودیکہ **مولانا** نے حسب عادت اُن فرقہ پرستوں کو ملامت کرنے سے احتراز کیا لیکن جس انداز میں اُنہوں نے اِن رجحانات کا ذکر کیا وہ ایسا تھا کہ اُنہوں نے اپنے اور اس فرقہ پرستی اور رجعت پسندی

کے درمیان ایک حدِ فاصل معین کر دی۔

۱۹۴۷ء سے بہت پہلے ۱۹۱۳ء میں مولانا نے الہلال کے صفحات پر لکھا تھا کہ:-

میرے عقیدے میں ضرورت اور وقت جب حق کے ساتھ جمع ہو جائیں تو پھر خدا کی بنائی ہوئی اس سقفِ نیلگوں کے نیچے کوئی شے ایسی نہیں جو اعلان کے لئے "مجبوری" ہو سکے اور اگر ہو تو وہ تمہارے جس کا تصور ہے۔ اعلان حق کے وجوب کا بطلان نہیں ہو سکتا۔

میں موجودہ حالات کو کبھی بھی ایسے تعبیراتِ باطلہ سے مخفی نہیں کر سکتا جس سے اُس کی اصلی حقیقت پر پردے پڑ جائیں۔ اگر تم کسی خونچکاں نعش پر ایک ریشمیں لحاف ڈال دو گے تو کیا یہ ثابت کر سکو گے کہ وہ مردہ نعش نہیں ہے۔

اپنے اس یقین کی بہت مستحکم عمارت مولانا نے سب سے پہلے الہلال ہی کے صفحات پر تعمیر کی تھی:-

الہلال ابتدا سے حق کی قوت کا واعظ ہے اور اللہ علیم ہے کہ مجھے سورج اور چاند کے وجود کا اتنا یقین نہیں جتنا کہ حق کی کامیابی اور باطل کے خسران پر ایمان ہے۔ یہ میرے محسوسات اور مرئیات ہیں اور ان میں کسی کو مجھ سے لڑنے کی ضرورت نہیں۔

مجوزہ مسلم یونیورسٹی کے مباحث میں الہلال نے اپنا جو مقام معین کیا اُس کو مولانا نے ایمان اور ضمیر کا حکم قرار دے کر فرمایا کہ :-

یہ حکم بالکل اس سے بے پرواہ ہے کہ لوگوں کا کیا حال ہے۔ کوئی بھی بات اس لئے نہیں ترک کر دی جا سکتی کہ لوگ اُس کا استقبال نہیں کریں گے۔ سچ سچ ہے اگرچہ تمام عالم میں ایک بھی اُس کا دوست نہ ہو۔ البتہ یہ حالات و واردات اور ہیں جن کے سمجھنے سے اپنے دوستوں اور بزرگوں کو عرصہ تک معذور و مجبور سمجھتا ہوں .... جس چیز کو آپ لوگوں نے ایمان سمجھا ہے اپنے عقیدے میں وہی کفر ہے، حق کی پرستش کے لئے اولین شے قربانی ہے اور آپ کا دماغ ابھی اُس کا تصور نہیں کر سکتا۔ ساری عمر نفس پرستی میں کٹی ہے اب چند لمحوں کے اندر آپ کو خدا کیسے دکھلا دوں اپنی اپنی راہ ہے اور اپنا اپنا مذہب .... جن دلوں کو خدا اپنے نورِ ہدایت کے لئے چُن لیتا ہے ان میں اور تم میں یہی فرق ہے کہ وہ آج جس چیز کو دیکھتے ہیں تم کل دیکھو گے ....

سب سے پہلی بصارت جو اس واقعہ میں ہے ہمارے لئے وہی ہے جس کو آغاز اشاعت الہلال سے بار بار

کہہ چکا ہوں۔ لیکن وہ میرا ایک ایسا استحضار محکم اور ایقان قلبی ہے جس کی صدا ہر آن اور ہر لمحہ میرے اندر سے اُٹھتی رہتی ہے اور میں خواہ کتنی مرتبہ اس کو دہراؤں لیکن تھکنے کے بجائے ہر دفعہ ایک راحت تازہ پاتا ہوں وہ حق کی فتحمندی اور ہر مظہر باطل کی شکست کا قانون الٰہی ہے۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سچائی کی فاتحانہ حقیقت پر میرا اعتماد ہے اور اعلان حق اور امر بالمعروف کا فرض شرعی خوف ظنون و ہجوم شبہات سے ساقط نہیں کیا جا سکتا۔ اگر دنیا میں ایسے لوگ ہیں جن کو چراغ کی روشنی دھندلی نظر آتی ہے تو یہ اُن کی آنکھوں کا ضعف ہے جس کو دُور کرنا چاہیئے۔ اُن کی خاطر چراغ گُل نہیں کئے جا سکتے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

میں ایک یقین بخش بصیرت کے ماتحت اپنے اصولوں کو قرار دے چکا ہوں اور جن لوگوں کو حق اور صداقت کا مخالف یقین کر لیتا ہوں اُن کے بارے میں جو کچھ میرے خیالات ہوتے ہیں خواہ وہ اندرائن کے پھل سے زیادہ کڑوے اور تلوار کے زخم سے زیادہ تکلیف دہ ہوں بغیر نفاق اور ظاہر داری کے صاف صاف کہہ دیتا ہوں۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جب تک کہ میرے عقیدہ کی

غلطی مجھ پر واضح نہ کردی جائے میں اُس کے مطابق
کام کرنے پر مجبور رہوں اور کسی اعتراض اور کسی مخالفت
سے متزلزل نہیں ہو سکتا۔

مولانا خود اپنے عزم و عزیمت کی کارفرمائی کا ذکر ہر دفعہ ایک نئے انداز سے فرماتے ہیں، لیکن ہر انداز ایسا ہوتا ہے کہ اُس میں اُن کی انفرادیت نمایاں رہتی ہے۔ جو راہ اُنہوں نے دوسروں سے الگ اختیار کی اُس کی ہمہ گیری کا اس طرح ذکر فرماتے ہیں کہ:۔

یہ راہ اس طرح طے نہیں کی جا سکتی کہ اُس کے اٹکاؤ کے ساتھ دوسرے لگاؤ بھی لگائے رکھئے۔ راہ مقصد کی خاک بہت غیور واقع ہوئی ہے، وہ رہرو کی جبینِ نیاز کے سارے سجدے اس طرح کھینچ لیتی ہے کہ پھر کسی چوکھٹ کے لئے کچھ باقی نہیں رہتا۔

راہ کے غیور ہونے کا ذکر درحقیقت راہی کے غیور ہونے کی طرف ایک بلیغ اشارہ ہے۔ **مولانا** کے عزم نے کسی دوسرے لگاؤ اور اٹکاؤ کے بغیر اپنا راستہ معین کیا اور اُس سے ہٹنے کے لئے کبھی تیار نہ ہو سکے۔ یہی اُن کی تنہائی اور کم آمیزی کا بھی راز ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اپنی راہ میں اُنہوں نے کسی اٹکاؤ اور لگاؤ کو اپنی عزیمت کے شان کے شایاں سمجھا ہی نہیں۔ اپنے مزاج کی اس کیفیت کو وہ دو چار پیش پا افتادہ مثالوں میں واضح فرماتے ہیں۔ مثلاً سگریٹ پینے کے معاملہ میں اپنے

ارادہ کی قوت کا ذکر فرماتے ہیں کہ جبتک قید رہے باوجود ان آسانیوں کے جو میسر تھیں جب ایک دفعہ بھی سگریٹ نہ پینے کا ارادہ کرلیا تو پھر ہرگز ہرگز نہ پیا حتیٰ کہ جب قید کا زمانہ ختم ہوا اور چلتے وقت جیلر نے ایک سگریٹ پیش کیا تو

یقین کیجیئے کہ جس درجہ عزم کے ساتھ دو سال پہلے سگریٹ ترک کیا تھا اتنے ہی درجہ کی آمادگی کے ساتھ یہ پیش کش بھی قبول کرلی۔ نہ ترک میں دیر لگی تھی نہ اب اختیار میں جھجک ہوئی۔ نہ محرومی پر ماتم تھا نہ حصول پر نشاط۔ ترک کی تلخکامی نے جو مزا دیا وہی اب اختیار کی حلاوت میں محسوس ہونے لگا تھا ....

... ترک و اختیار دونوں کا نقش عمل اسطرح بٹھائیے کہ آلودگیاں دامن ترکردیں مگر دامن پکڑ نہ سکیں اس راہ میں کانٹوں کا دامن سے اُلجھنا مخل نہیں ہوتا۔ دامن گیر ہونا مخل ہوتا ہے۔ کچھ ضروری نہیں کہ آپ اس ڈر سے اپنا دامن سمیٹے رہیں کہ کہیں بھیگ نہ جائے، بھیگتا ہے تو بھیگنے دیجیئے لیکن آپ کے دست وبازو میں یہ طاقت ضرور ہونی چاہیئے کہ جب چاہا اس طرح نچوڑ کر رکھدیا کہ آلودگی کی ایک بوند بھی باقی نہ رہے۔ یہاں کامرانی سود و زیاں کی کاوش میں نہیں ہے بلکہ سود و زیاں سے آسودہ حال

رہنے میں ہے۔ نہ تو تردامنی کی گرانی محسوس کیجئے نہ
خشک دامانی کی سبکسری۔ نہ الودہ دامنی پر پریشان
حالی ہو نہ پاک دامانی پر سرگرانی۔

جبرواختیار اور انکار و قبول کے اس فلسفہ کو مولانا نے اپنی زندگی کا پاسنگ بنایا اور اس طرح اُنہوں نے اپنی انفرادیت کے لئے عزیمت کا راستہ صاف کیا اور اپنے کو زشت وخوب کی بحث سے بالاتر کر دیا اور یہ بھی ظاہر کر دیا کہ وہ محض عوامی اصطلاحوں سے متاثر نہیں ہوتے۔ اُن کے اور عوام کے درمیان یہی حد فاصل ہے۔

پھر اپنے مقصود کے ساتھ اپنے معاملہ کو بھی کچھ اس طرح واضح کیا کہ گویا وہ عوامی زندگی کی راہوں سے الگ ایک راہ ہے۔ اشارہ دوسروں کی طرف ہے لیکن کہہ رہے ہیں سب اپنے متعلق:-

ایک خشک اور ناآشنائے شورش مقصد سے اُن
کی پیاس نہیں بجھ سکتی۔ اُنہیں ایسا مقصد چاہیئے جو
اضطراب کے انگاروں سے دہک رہا ہو۔ جو اُن کے
اندر شورش و سرمستی کا ایک تہلکہ مچا دے جس کے
دامن ناز کو پکڑنے کے لئے وہ ہمیشہ اپنا گریبان وحشت
چاک کرتے رہیں۔ . . . . ایک ایسا
بلائے جان مقصد جس کے پیچھے اُنہیں دیوانہ وار دوڑنا پڑے
جو دوڑنے والوں کو ہمیشہ نزدیک بھی دکھائی دے اور دور بھی

ہوتا رہے۔ نزدیک اتنا کہ جب چاہیں ہاتھ بڑھا کر
پکڑلیں اور دُور اتنا کہ اُس کی گرد راہ کا بھی سراغ نہ
پاسکیں۔

عزم اور عزیمت کے فلسفہ کی اس بلندی پر ایک شاعر اور ادیب کے تصورات کی دنیا میں وہ اپنے مقصودِ حیات کو بجلی کی کڑک میں دیکھتے ہیں اور بادل کی گرج میں سُنتے ہیں:۔

آجکل کی گرمیوں کی راتوں میں جبکہ ایک عالم رات کی
ٹھنڈی ہواؤں کے مزے لوٹتا ہے اور خواب نوشیں کی
راحت بخشیوں میں مست و بے خبر ہوتا ہے۔ جبکہ ابتدائی
نصف رات کی چہل پہل ختم ہوجاتی ہے اور پچھلے پہر کا
مقدس اور لاہوتی وقت شروع ہوتا ہے تو میں
اس وقت اپنے غمکدہ کے کنج باغ کی ایک سنسان
اور فکر پرور تنہائی میں عیش خواب سے مجبور اور راحت
نالش و بستر سے محروم پڑا ہوتا ہوں۔ پھر تم یقین کرو
کہ میں اس کو دیکھتا ہوں جسکی روشنی بجلی کی طرح
شعلہ آسا لیکن بجلی کی طرح نظروں کو خیرہ کرنے والی
نہیں ہوتی۔ میرے کانوں میں اُس کی صدائے سامعہ نواز
و نغمہ آسا آتی ہے۔ جو دریاؤں کی آہستہ روانی کے
مشابہ یا کسی دور کی صدائے ارغنوں کی مانند ہوتی ہے۔

میں پکارنے والے کی پکار سنتا ہوں جس کی نسبت
نہیں کہہ سکتا کہ وہ اوپر ہے، پھر مجھے خیال ہوتا ہے کہ وہ
اوپر ہے!



تضاد زندگی کا ضروری عنصر ہے، غور سے دیکھئے تو وہ کوئی عیب نہیں۔ دو متضاد عناصر کے تصادم ہی سے بسا اوقات قوت اور محرکات پیدا ہوتے ہیں Dynamic ہونے کے لئے بظاہر اجنبی عناصر کا ایک دوسرے سے ٹکرانا ضروری ہوتا ہے، یہی حال انسانی فطرت کا ہے۔ مولانا اپنی فطرت کے تضادات کو شاعرانہ اور فلسفیانہ انداز میں باربار بیان فرماتے ہیں۔ غبار خاطر کے ایک مکتوب میں پہلے تو آتشدان سے اپنی طبیعت کے لگاؤ کا ذکر کرتے ہیں اور پھر اپنے پیراکی کے شوق کو اس طرح سامنے لاتے ہیں:-

سبحان اللہ! طبع بوقلموں کی نیرنگ آرائیاں دیکھیئے۔ ایک
طرف دریا سے ہم عنانی کا یہ ذوق و شوق اور دوسری

طرف آگ کے شعلوں سے سیراب ہونے کی یہ تشنگی!
شاید یہ اس لئے ہو کہ اقلیم زندگی کی سطح پر پانی بہتا ہے اور
تہ میں آگ بھڑکتی رہتی ہے!

یوں تو آپ اس کو شاعرانہ عبارت آرائی کی صنعت تضاد کہہ لیجے، لیکن حقیقت سے ان اشاروں کا رشتہ بہت گہرا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ **مولانا** کے اندر یہ احساس موجود ہے کہ عوام اُن کی زندگی کے تفاوت سے بے خبر نہیں ہیں اور بعض اوقات جب ایسی کوئی واردات پیش آجاتی ہے جس میں یہ تضاد ظاہر ہوتا ہے تو لوگ سوچنے لگتے ہیں کہ ایک ہی طبیعت کے یہ دو رخ کیونکر ممکن ہوئے۔ **مولانا** اپنے شاعرانہ انداز میں اس تضاد کی تصریح فرماتے ہیں اور اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں کہ بسا اوقات سطح کے اوپر جو کچھ ہوتا ہے، اُس سے بالکل مختلف بہت کچھ سطح کے نیچے ہوتا ہے۔

مولانا نے فلسفہ حیات کا ایک خاص سانچہ اپنے لئے بنا لیا ہے اُسی سانچہ میں اُن کی زندگی کا ہر خوش و ناخوش بخوبی ڈھل گیا ہے **مولانا** کے وجود معنوی اور حیات ذہنی کی جو جیتی جاگتی تصویریں میں ان اوراق میں پیش کر رہا ہوں اُن کے خدوخال کی مجموعی ہیئت میں **مولانا** کے خلوت افکار کی ایک دلچسپ تصویر نظر آتی ہے۔ زندگی کے حقائق کو وہ بار بار اپنے ہی رنگ میں اس طرح بیان فرماتے ہیں کہ ہر چار سطروں کے بعد ایک لفظ اُن کی بے پناہ اور بے محابا انفرادیت کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ اپنی

زندگی کے عناصر میں جو توازن مولانا نے قائم فرمالیا ہے اُس پر سیاسی اور عمومی نقطہ نظر سے کتنی ہی تنقید کی جائے اور اس بات کی کتنی ہی شکایت کی جائے کہ مولانا کی انفرادیت نے اُنہیں عمومی زندگی سے بے تعلق کر دیا ہے لیکن اس حقیقت سے تو انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مولانا نے اپنی زندگی کے ایک خاص اسلوب کا جو معیار اور زاویہ قائم کر دیا ہے وہ کبھی متزلزل نہیں ہوتا ۔ نہ تو اُن کی خلوتوں میں اور نہ سیاسی مشاغل کی جلوت میں ۔ اپنی قید خانہ کی زندگی کے متعلق ایک مکتوب میں لکھتے ہیں کہ :-

میں نے قید خانہ کی زندگی کو دو متضاد فلسفوں سے ترکیب دی ہے ۔ اُس میں ایک جزو رواقیہ Sotics کا ہے اور ایک لذتیہ Epicurlus

پنبہ را آشتی اینجا بہ شرار افتاد است

جہاں تک حالات کی ناگواری کا تعلق ہے رواقیت سے اُن کے زخموں پر مرہم لگاتا ہوں اور اُن کی چبھن بھول جانے کی کوشش کرتا ہوں ۔ . . . .
جہاں زندگی کی خوشگواریوں کا تعلق ہے لذتیہ کا زاویہ نگاہ کام میں لاتا ہوں اور خوش رہتا ہوں ۔ . . . . . .
میں نے اپنے کاک ٹیل کے جام میں دونوں بوتلیں اُلٹ

دیں۔ ذوق بادہ آشامی بغیر اس جام مرکب کے تسکین نہیں پاسکتا تھا۔ البتہ کاک ٹیل کا یہ نسخہ خاص ہر خام کار کے بس کی چیز نہیں۔ صرف بادہ گسارانِ کہن ہی اُسے کام میں لاسکتے ہیں۔ درموتہ اور جن پینے والے اس رطل گراں کے متحمل نہ ہوسکیں گے۔

اسی بات کو ایک دوسرے انداز میں فرماتے ہیں :۔

اور پھر زندگی کی جن حالتوں کو ہم راحت والم سے تعبیر کرتے ہیں اُن کی حقیقت بھی اس سے زیادہ کیا ہوئی کہ اضافت کے کرشموں کی صورت گری ہے۔ یہاں نہ مطلق راحت ہے نہ مطلق الم۔ ہمارے تمام احساسات سراسر اضافی ہیں۔

دویدن رفتن ایستادن نشستن خفتن و مردن

اضافتیں بدلتے جاؤ، راحت والم کی نوعیتیں بھی بدل جائینگی یہاں ایک ہی ترازو لیکر ہر طبیعت اور ہر حالت کا احساس تولا نہیں جاسکتا۔ راحت والم کا احساس ہمیں باہر سے لاکر کوئی نہیں دیا کرتا۔ یہ خود ہمارا ہی احساس ہے جو کبھی زخم لگاتا ہے اور کبھی مرہم بن جاتا ہے۔

چھوٹے بڑے ہر واقعہ میں **مولانا** زندگی کو اپنی نظر کے اس زاویہ سے دُور بھاگنے نہیں دیتے۔ قلعہ احمد آباد میں داخل ہوتے وقت اُس

سیدھی سڑک کا ذکر یوں فرماتے ہیں:۔

اسٹیشن سے قلعہ تک سیدھی سڑک چلی گئی ہے۔ راہ میں کوئی موڑ نہیں ملی۔ میں سوچنے لگا کہ مقاصد کے سفر کا بھی کچھ ایسا ہی حال ہے۔ جب قدم اُٹھا دیا تو پھر کوئی موڑ نہیں ملتی۔ اگر مڑنا چاہیں تو صرف پیچھے ہی کی طرف مڑ سکتے ہیں۔ لیکن پیچھے مڑنے کی راہ یہاں پہلے ہی سے بند ہو جاتی ہے۔

قید کی مدت کا حساب مولانا کے فلسفہ میں اس طرح لگایا جاتا ہے:۔

غور کیجیئے تو انسان کی زندگی اور اس کے احساسات کا بھی عجب حال ہے۔ تین برس کی مدت ہو یا تین مہینوں کی، جب گذرنے پر آتی ہے تو گذر ہی جاتی ہے۔ گذرنے سے پہلے سوچیئے تو حیرانی ہوتی ہے کہ یہ پہاڑ سی مدت کیونکر کٹیگی۔ گذرنے کے بعد سوچیئے تو تعجب ہوتا ہے کہ جو کچھ گذر چکا وہ چند لمحوں سے زیادہ نہ تھا ....

کل ۹ اگست کو سوا دو بجے قلعہ احمد نگر کے حصار کہنہ کا نیا پھاٹک میرے پیچھے بند کر دیا گیا۔ اس کارخانہ ہزار شیوہ و رنگ میں کتنے دروازے کھولے جاتے ہیں تاکہ بند ہوں اور کتنے ہی بند کیئے جاتے ہیں تاکہ کھُلیں! دو ماہ کی مدت بظاہر کوئی مدت معلوم نہیں ہوتی۔

دو کروٹیں ہیں عالم غفلت میں خواب کی
لیکن سونچتا ہوں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے تاریخ کی
ایک پوری داستان گذر گئی۔

اپنے اسی فلسفہ میں مولانا زندگی کے نشیب و فراز اور بیش و کم کو کچھ اس طرح سمو دیتے ہیں کہ

اگر حقیقت حال کو زیادہ نزدیک ہو کر دیکھیئے تو واقعہ یہ ہے کہ انسان کی زندگی کی پوری مدت ایک صبح و شام سے زیادہ نہیں۔ صبح آنکھیں کھلیں، دوپہر اُمید و بیم میں گذری رات آئی تو پھر آنکھیں بند تھیں۔

شورے شد و از خواب عدم چشم کشودیم
دیدیم کہ باقی است شب فتنہ غنودیم

لیکن پھر غور کیجیئے تو اسی ایک شام کے بسر کرنے کے لئے کیا کیا جتن نہیں کرنے پڑتے۔ کتنے صحراؤں کو طے کرنا پڑتا ہے، کتنے سمندروں کو لانگنا پڑتا ہے، کتنی چوٹیوں سے کودنا پڑتا ہے، پھر آتش و پنبہ کا افسانہ ہے اور برق و خرمن کی کہانی ہے۔

لیکن مولانا کے فلسفہ کا رنگ کہیں بھی منفی نہیں ہے۔ وہ زندگی میں کوئی کوئی منفی پہلو تلاش نہیں کرتے، باوجودیکہ کسی نہ کسی طرح اُن کی خلوت افکار نے اپنے لئے ایک منفی سانچہ بنا لیا ہے۔ تاہم وہ اپنے فلسفہ میں حق و باطل

اور عیب و صواب اور تاریکی و روشنی کے صحیح امتزاج ہی کو زندگی کا صحیح زاویہ قرار دیتے ہیں۔ اور بہت سی چھوٹی چھوٹی باتوں سے بڑے بڑے نتائج اخذ کر لیتے ہیں۔ مثلاً اپنی چائے پینے کی عادت کا ذکر فرماتے ہیں:

آپ کہیں گے کہ چاء پینے کی عادت، بجائے خود ایک علت ہے۔ اس پر مزید علت ہائے نافرجام کا اضافہ کیوں کیا جائے۔ اس طرح کے معاملات میں امتزاج و ترکیب کا طریقہ کام میں لانا، علتوں پر علتیں بڑھانا۔ گویا حکایت بادۂ تریاک کو تازہ کرنا ہے۔ میں تسلیم کروں گا کہ یہ تمام خودساختہ عادتیں بلاشبہ زندگی کی غلطیوں میں شامل ہیں۔ لیکن کیا کہوں جب کسی معاملہ کے اس پہلو پر غور کیا طبیعت اس پر مطمئن نہ ہو سکی کہ زندگی کو غلطیوں سے یکسر معصوم بنا دیا جائے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس روزگار خراب میں زندگی کو زندگی بنائے رکھنے کے لئے کچھ نہ کچھ غلطیاں ضرور کرنی چاہئیں

یہ فطری انسانیت کا نقطہ نظر ہے جس کا نقشہ خیالات کی وسعتوں ہی میں صحیح بن سکتا ہے۔ مولانا کی انفرادیت زندگی کی عام سطح سے کتنی ہی بلند اور دور نہ ہو عوامی زندگی اور اس کے اصطلاحی تضادات کے متعلق اُن کا مطالعہ فطرت کے صحیح مطالعہ پر مبنی ہے اور صرف یہی ایک مقام ہے جہاں وہ عوامی زندگی سے بہت قریب آجاتے ہیں۔ اُس کا

سبب مولانا کی نہایت ہمت نواز قوت مطالعہ و مشاہدہ ہے جس کی چند بہت ہی دلچسپ مثالیں غبار خاطر میں نظر افروز ہوتی ہیں۔

۹

اس قسم کی مثالوں سے یہ حقیقت مترشح ہوتی ہے کہ مولانا زندگی کے لازوال قانون اور اس کے چھوٹے بڑے مظاہروں کو کس قدر گہری نظر سے دیکھتے ہیں اور کس طرح زندگی کے پیش پا افتادہ واقعات سے بھی بڑے بڑے مضمرات کا پتہ پا لیتے ہیں۔ چڑیا چڑے کی کہانی میں وہ اپنے اس "مطالعہ" کی بعض دلچسپ مثالیں بہت ہی دلچسپ طریقہ سے پیش فرماتے ہیں۔ چڑیا کے بچے نے کسطرح قوت پرواز حاصل کی، قانون قدرت کے اس عمل کی توضیح یوں فرماتے ہیں:۔

> پھر جوں جوں بچوں کے پر بڑھنے لگتے ہیں، وجدان کا فرشتہ آتا ہے اور ماں کے کان میں سرگوشیاں شروع کر دیتا ہے کہ اب اُنہیں اُڑنے کا سبق سکھانا چاہیئے۔

معلوم ہوتا ہے کہ موتی (یہ نام مولانا نے احمد نگر کے

قلعہ میں اپنے کمرہ کی ایک چڑیا کا رکھدیا تھا) کے کانوں میں یہ سرگوشی شروع ہو گئی تھی۔ ایک صبح کیا دیکھتا ہوں کہ گھونسلے سے اُڑتی ہوئی اُتری تو اُس کے ساتھ ایک چھوٹا سا بچہ بھی ادھوری پرواز کے پر و بال کے ساتھ نیچے گر گیا۔ موتی بار بار اُس کے پاس جاتی اور اُڑنے کا اشارہ کر کے اوپر کی طرف اڑنے لگتی لیکن بچہ میں اثر پذیری کی کوئی علامت دکھائی نہیں دیتی۔ وہ پر پھیلائے آنکھیں بند کئے بے حس و حرکت پڑا تھا۔ میں نے اُسے اُٹھا کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ ابھی پر پوری طرح بڑھے نہیں ہیں۔ گرنے کی چوٹ کا اثر ابھی تازہ ہے اور اُس نے بے حال کر دیا ہے . . . . بہرحال اُسے اُٹھا کر دری پر رکھ دیا۔ موتی چاول کے ٹکڑے چُن چُن کر لاتی اور اُسے کھلا دیتی۔ وہ چُوں چُوں کی مدھم اور اکھڑی سی آواز نکال دیتا۔ اور پھر دم بخود آنکھیں بند کئے پڑا رہتا۔ پورا دن اسی حالت میں نکل گیا۔ دوسرے دن بھی اُس کی حالت ویسی ہی رہی۔ ماں صبح سے لے کر شام تک اُڑنے کی تلقین کرتی رہی مگر اس پر کچھ ایسی مُردنی چھا گئی تھی کہ کوئی جواب نہیں ملتا۔ میرا خیال تھا کہ اب بچے گا نہیں لیکن تیسرے دن صبح کو ایک عجیب معاملہ پیش آیا۔

دھوپ کی ایک لکیر کمرہ کے اندر دور تک چلی گئی تھی، یہ اُس پر جا کر کھڑا ہو گیا، پر گرے ہوئے، پاؤں مُڑے ہوئے آنکھیں حسب معمول بند تھیں۔ اچانک کیا دیکھتا ہوں کہ آنکھیں کھول کر ایک جھُرجھُری سی لے رہا ہے، پھر گردن آگے کر کے فضا کی طرف دیکھنے لگا پھر گرے ہوئے پروں کو سکیڑ کر ایک دو مرتبہ کھولا بند کیا۔ پھر جو ایک مرتبہ جست لگا کر اُڑا تو بیک دفعہ تیر کی طرح میدان میں جا پہونچا اور پھر ہوائی کی طرح فضا میں اُڑ کر نظروں سے غائب ہو گیا یہ منظر اس درجہ عجیب اور غیر متوقع تھا کہ پہلے تو مجھے اپنی نگاہوں پر شبہ ہونے لگا، کہیں دوسری چڑیا کو اُڑتے دیکھ کر دھوکے میں نہ پڑ گیا ہوں۔ لیکن ایک واقعہ ظہور میں آچکا تھا اب اُسمیں شبہ کی گنجائش کہاں باقی رہی تھی۔ کہاں تو بے حالی و درماندگی کی وہ حالت کہ دو دن تک ماں سر کھپاتی رہی مگر زمین سے بالشت بھر بھی اونچا نہ ہو سکا اور کہاں آسماں پیمائیوں کا یہ انقلاب انگیز جوش کہ پہلی ہی اُڑان میں عالم حدود و قیود کے سارے بندھن توڑ ڈالے اور فضائے لا منتہائی کی نا پیدا کنار وسعتوں میں گم ہو گیا! کیا کہوں اس منظر نے کیسی خود رفتگی کی حالت طاری کر دی تھی۔ بے اختیار یہ شعر زبان پر آ گیا

تھا کہ:۔

نیروئے عشق بیں کہ دریں دشت بیکراں
گامے نہ رفتہ ایم و بہ پایاں رسیدہ ایم

دراصل یہ کچھ نہ تھا، زندگی کی کرشمہ سازیوں کا ایک معمولی سا تماشہ تھا جو ہمیشہ ہماری آنکھوں کے سامنے گزرتا رہتا ہے۔ مگر ہم اُسے سمجھنا نہیں چاہتے۔ اس چڑیا کے بچے میں اُڑنے کی استعداد اُبھر چکی تھی وہ اپنے کنج نشیمن سے نکل کر فضائے آسمانی کے سامنے آکھڑا ہوا تھا۔ مگر ابھی تک اُس کی خودشناسی کا احساس بیدار نہیں ہوا تھا۔ جب تک وہ اپنی حقیقت سے بے خبر تھا ماں بار بار اشارے کرتی تھی۔ ہوا کی لہریں بار بار پروں کو چھوتی ہوئی گزر جاتی تھیں۔ زندگی کا ہنگامہ ہر طرف سے آ آکر بڑھاوے دیتا تھا لیکن اُس کے اندر کا چولھا اس طرح ٹھنڈا ہو رہا تھا کہ تاثر کی کوئی گرمجوشی بھی اُسے گرم نہ کر سکتی تھی۔ . . . . لیکن جوں ہی کہ اُس کی سوئی ہوئی خودشناسی جاگ اُٹھی اور اُسے اس حقیقت کا عرفان حاصل ہو گیا کہ میں اُڑنے والا پرند ہوں اچانک قلبِ بے جان کی ہر چیز از سر نو جاندار بن گئی۔

وہی جسم زار جو بے طاقتی سے کھڑا نہیں ہوسکتا تھا اب سرو قد کھڑا تھا۔ وہی کانپتے ہوئے گھٹنے جو جسم کا بوجھ بھی نہیں سہار سکتے تھے اب تن کر سیدھے ہوگئے وہی گرے ہوئے پر جن میں زندگی کی کوئی تڑپ دکھائی نہیں دیتی تھی اب سمٹ سمٹ کر اپنے آپ کو تولنے لگے تھے۔ چشم زدن کے اندر جوش پرواز کی ایک برق آسا تڑپ نے پورا جسم ہلا کر اُچھال دیا اور پھر جو دیکھا تو درماندگی و بے حالی کے سارے بندھن ٹوٹ چکے تھے اور مرغ ہمت عقاب دار فضائے لانہتائی کی لاانتہائیوں کی پیمائش کر رہا تھا۔ ۔ ۔ ۔
۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اُڑنے کے سروسامان میں کونسی چیز تھی جو اس گرفتار قفسِ حیات کے حصہ میں نہیں آئی تھی۔ فطرت نے سارا سروسامان مہیا کر کے اُسے بھیجا تھا اور ماں کے اشارے اُسے دم بدم گرم پروازی کے لئے اُکسا رہے تھے لیکن جب تک اُس کے اندر خود شناسی پیدا نہیں ہوئی اور اس حقیقت کے عرفان حاصل نہیں ہوا کہ وہ طائر بلند پرواز ہے اُس کے بال و پر کا سارا ساز و سامان بیکار رہا۔ ۔

مطالعہ اور مشاہدہ کی اُس قوت سے قطع نظر جس کا اظہار مولانا نے چڑیا چڑے کی کہانی" اور قلعہ احمد نگر کے قیدیوں کی باغبانی کی داستان میں فرمایا ہے (اور یہ بھی ادب کا ایک ایسا پہلو جس پر بہت کچھ لکھا جاسکتا ہے) مولانا نے اس تمام کہانی میں خود اپنے فلسفہ زندگی اور عرفان حیات کے متعلق اپنی فکر و نظر کے متحرک نقوش کچھ اس طرح پیش کر دئے ہیں اور اُن کے ادب کے نفسیاتی پس منظر کا ایک گوشہ ظاہر ہو جاتا ہے اور معلوم ہو جاتا ہے کہ مولانا کس انداز سے اور کس رُخ پر زیادہ سوچتے ہیں۔ اقبال نے بھی فلسفۂ خودی کو ایک رمز ہستی کی حیثیت سے پیش کیا ہے مگر مولانا اور اقبال کے درمیان فکر و نظر کا ایک فرق بیّن ہے۔ اقبال رمز خودی کا فلسفہ صرف مسلمان کے لئے پیش کرتے ہیں۔ اوسی کو اپنا مخاطب بناتے ہیں اور اُسی کو زندگی کا پیام دیتے ہیں مگر مولانا کا فلسفہ حیات اقبال کے تصورات سے زیادہ وسیع اور زیادہ ہمہ گیر ہے۔ وہ اقبال سے زیادہ "مذہبی" ہونے کے باوجود خود شناسی کے فطری تقاضوں کو انسانیت حتیٰ کہ ہر جاندار کے ساتھ منسوب کرتے ہیں اور چڑیا کے بچے کے لئے بھی خود شناسی کا تقاضا اتنا ہی ضروری سمجھتے ہیں جتنا کہ انسانوں کے لئے۔ اقبال نے بھی شہباز اور شاہیں کو ضمناً اپنا موضوع بنایا ہے لیکن اقبال صرف مسلمانوں کے لئے قوت عمل کا ایک نسخہ تجویز کرتے ہیں اور مولانا تمام مخلوقات کی اُس قوت نمو کا ذکر کرتے ہیں۔ جو اس میں ودیعت ہے۔ مولانا شاہین و شہباز کے بجائے

صرف چڑیا چڑے کی کہانی میں ساری انسانیت کو حرکت کا ایک پیام دیتے ہیں مگر اقبال اپنے بلند ترین افکار میں انسانیت کے تصور سے اس قدر وابستہ نظر نہیں آتے جتنے کہ صرف اسلام اور مذہب کے تصور سے۔ اقبال کے افکار کی یہ تحدید اُس سیاسی جوش و خروش کے عالم میں تو نظر انداز ہو گئی، جب مسلمان اور "انسان" دو الگ وجود بن گئے تھے اور جب ملائی اور برہمنیت کے پیمانوں میں سیاسی مسائل جانچے جا رہے تھے مگر اب جبکہ ۴/۱ کروڑ مسلمان خود اپنے ہی لیڈروں کی خود غرضی کا شکار ہو گئے ہیں تو یہ بات سمجھ میں آ رہی ہے کہ اقبال کے پیام کی روح انسانیت کے وسیع تر پھیلاؤ میں نہ پھیل سکی اور اسی لئے اقبال کا پیام فرقہ پرستوں کے لئے فرقہ پرستی کا ایک فتنہ انگیز کھلونا بن گیا۔ ورنہ خود شناسی اور خودی کا وہ فطری عمل جس کو مولانا نے ایک چڑیا کے بچے کے پروں میں کارفرما دیکھا انسان کے پیکر میں اور بھی زیادہ نسل اور فرقہ اور مذہب کی تنگ نظری سے آزاد ہے۔ بہرحال یہ بحث چونکہ مولانا کے سیاسی افکار سے متعلق نہیں اور صرف اُن کے ادب اور اُس ادب کے مبینات Expressions سے تعلق رکھتی ہے اس لئے اقبال کے فلسفہ خودی اور مولانا کے فلسفہ خودشناسی کے درمیان کسی موازانہ کا یہ محل نہیں۔ اس موقعہ پر تو کہنے کی بات صرف اتنی ہی ہے کہ

برگ درختان سبز در نظر ہوشیار
ہر ورقے دفترے است معرفتے کردگار

مولانا نے اپنے ادب کو جس طرح رموز فطرت کا کارندہ بنایا ہو وہ حسنِ بیان اور مشاہدہ فطرت اور مطالعہ تخلیق کا ایک مخصوص انداز ہے۔ ورنہ چڑیا چڑے کی کہانیاں تو مختلف انداز میں بہت سی لکھی گئی ہیں اور ہر کہانی انسانی زندگی کے کسی نہ کسی پہلو کی ترجمان ہے۔ لیکن مولانا نے چڑیا چڑے کی کہانی میں اپنے ادیبانہ افکار کو کچھ اس قدر پھیلا دیا ہے کہ اس مخروطی آئینہ کے جس پہلو کو دیکھیئے زندگی کی ایک تصویر نظر آتی ہے۔

اس قسم کے موضوعات پر لکھنے کے لئے مشاہدہ اور تحریر میں ایک خاص توازن کی ضرورت ہوتی ہے۔ دراصل زورِ قلم اور مشاہدہ ادب کے دو اہم ترین اجزاء ہیں اور ان دونوں عناصر سے اُن کے صحیح مقام پر صحیح کام لینا ہی ایک ادیب کا آرٹ ہے۔ اس اعتبار سے اردو ادب ابھی تک بہت تہی دست ہے۔ الہلال اور البلاغ کے پڑھنے والوں کے لئے بھی مولانا کے ادب کا یہ پہلو شاید تعجب انگیز ہوگا اس لئے ادب کے اُس عالمانہ اور خطیبانہ انداز میں جو مولانا کا خاص اسلوب رہا ہے اس قسم کے مشاہدۂ فطرت کو شاذ ہی کوئی جگہ ملا کرتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اردو کے جدید ادب میں مولانا نے یہ ایک ایسی راہ پیدا کی ہے جو بالکل جدید ہے اور یقیناً اس قابل ہے کہ دوسرے ادیب بھی اُسے اختیار کریں۔

چڑیا چڑے کی کہانی میں ہم ایک چڑیا کی زندگی سے مولانا کی ذہانت کا ایک ایسا ربط دیکھتے ہیں جو مخصوص فطری رجحانات اور

نہایت بیدار قوت مشاہدہ کے بغیر قائم نہیں ہو سکتا۔ یہ کہانی جس مزاحی اور "ہلکے لٹریچر" کے انداز میں لکھی گئی ہے وہ بھی ایک خصوصیت ہے جو صرف کسی ایسے ہی ادیب کے حصے میں آتی ہے جس کے قلم اور افکار میں پوری ہم آہنگی قائم ہو۔ ادب کی تخلیق کے ایسے نمونے اپنی آپ ہی مثال ہوتے ہیں۔

چڑیا کے بچے کی خود شناسی کے علاوہ بھی اس کہانی میں بہت کچھ جو تبصرہ کے قابل ہے۔ یوں تصور کیجیئے کہ قلعہ احمد نگر کے قیدیوں کی اس بستی میں، انسانوں کی ہر بستی کی طرح یہ چڑیاں بھی آباد ہیں۔ مولانا اپنے کمرہ کی خلوت میں ان آباد کاروں کی روزانہ زندگی کا مطالعہ کرتے رہتے ہیں اس مطالعہ کے نتائج غبار خاطر کے ایک مکتوب میں اس طرح مندرج ہو گئے ہیں کہ گویا ایک مورخ نے قلعہ احمد نگر کی چڑیوں کے اس خاندان کو لازوال بنا دیا مولانا نے ان چڑیوں سے ربط پیدا کرنے کی پوری تفصیلات اپنے مکتوب میں بیان کی ہیں کہ کس طرح انہوں نے کرۂ ہوا کے اِن سیلانیوں سے راہ و رسم پیدا کی، کس طرح اجنبیت کی جھجک رفع ہوئی اور پھر کیونکر رفتہ رفتہ وہ اپنی خلوت میں ان "آہوانِ وحشی" کی محفل آرائیوں سے حصہ لینے لگے۔ آغاز کار میں ان عشوہ طرازان پراں سے راہ و رسم پیدا کرنے میں جو دقتیں پیش آئیں اور آخر میں جس طرح مولانا نے اپنے اور اُن کے درمیان حجابات کو ختم کیا اس تمام مہم کو درجہ بدرجہ اور قدم بقدم مولانا نے بیان فرمایا ہے۔ ایک چڑیا اور چڑے کے متعلق اپنے

تاثرات کے نقوش اس طرح پیش فرماتے ہیں:۔

التفات و تغافل کے ان عشوہ گریوں کی ابھی جلوہ پاشی
ہو ہی رہی تھی کہ ناگہاں ایک تنومند چڑے نے جو اپنی
قلندرانہ بے دماغی اور رندانہ جراتوں کے لحاظ سے
پورے حلقہ میں ممتاز تھا سلسلہ کار کی درازی سے
اکتا کر بے باکانہ قدم اٹھا دیا اور بزبان حال سے
نعرہ مستانہ لگاتا ہوا بیک دفعہ دانوں پر لوٹ
پڑا

زدیم بر صف رنداں و ہر چہ بادا باد!

یہ وہ منظر ہے کہ مولانا اپنے صوفے پر دانوں کی صورت میں محبت و
آشنائی کا جال بچھائے بیٹھے ہیں اور یہ عشوہ گران ہوائی ابھی تک زیادہ
بے تکلف ہونے پر آمادہ نہیں ہیں مگر

اس چڑے کا بیباکانہ اقدام ایسا دلپسند واقع ہوا کہ
اُسی وقت دل نے ٹھان لی کہ اس مرد کار سے رسم و راہ
بڑھانی چاہیئے۔ میں نے اُس کا نام قلندر رکھدیا کیونکہ
بے دماغی اور وارستگی کی سرگرانیوں کے ساتھ ایک
خاص طرح کا بانکپن بھی ملا ہوا تھا۔

اب مولانا اس منزل پر آتے ہیں جب اُن کے صوفے پر یہ محفل بے تکلف
برپا ہونے لگی تھی:

بارہا ایسا ہوا کہ میں اپنے خیالات میں محو، لکھنے میں مشغول ہوں۔ اتنے میں کوئی دلنشین بات نوک قلم پر آ گئی۔ یا عبارت کی مناسبت سے کوئی پُرکیف شعر یاد دلایا بے اختیار اُس کیفیت کی خودرفتگی میں سر و شانہ ہلنے لگا یا منہ سے "ہا" نکل گیا اور یکایک زور سے پروں کے اُڑنے کی ایک پھُرسی آواز سُنائی دی۔ اب جو دیکھتا ہوں تو معلوم ہوا کہ ان یاران بے تکلف کا ایک طائفہ میری بغل میں بیٹھا بے تامل اُچھل کود میں مشغول تھا۔ اچانک اُنہوں نے دیکھا کہ یہ پتھر اب ہلنے لگا تو گھبرا کر اُڑ گئے۔ عجب نہیں کہ اپنے جی میں کہتے ہوں کہ یہاں کونے پر ایک پتھر پڑا رہتا ہے مگر کبھی کبھی آدمی بن جاتا ہے۔

اس رسم و راہ کی بے تکلفی اب اس حد تک پہنچ چکی تھی کہ:

جوں ہی قلندر کی نظر پڑی فوراً جست لگائی اور ایک چکر لگا کر انگوٹھے پر آ کھڑا ہوا۔ اور پھر تیزی کے ساتھ دانوں پر چونچ مارنے لگا۔ اس تیزی میں کچھ تو طبع قلندرانہ کا قدرتی تقاضہ تھا اور کچھ یہ وجہ بھی ہو گی کہ دیر تک دانوں کا انتظار کرنا پڑا تھا چونچ کی تیز ضربوں سے دانے اڑ اڑ کر ڈھکنے کے باہر گرنے لگے۔ ایک دانہ انگلی کی جڑ کے پاس بھی گر گیا۔ اُس نے فوراً وہاں بھی چونچ ماردی اور ایسی خلاف

ماری کہ کیا کہوں۔ اگر ستم پیشوں کے جور و جفا کا خوگر نہ ہو چکا ہوتا تو یقین کیجیے کہ بے اختیار منہ سے چیخ نکل جاتی۔

قلندر کی جرات رندانہ کے پہلو بہ پہلو ایک چڑیا کا وجود بھی مولانا کی نظر میں جگہ پاتا ہے۔ اُس کا نام وہ "موتی" رکھ دیتے ہیں:۔

اس کا نام موتی ہے۔ موتی نے دو چار چکر لگائے اور نکل گئی گویا اندازہ کرنا چاہتی ہے کہ اس جزیرہ پر اترنے کے لئے محفوظ جگہ کونسی ہوگی۔ پھر دو بار آئی اور کہنی کے پاس اُتر پہونچے تک پہونچ گئی اور پہنچے سے ہتھیلی کی خاکنائے پر اُتر کر منقار درازیاں شروع کر دیں۔

اب ذرا موتی کا سراپا بھی ملاحظہ ہو کہ مولانا نے اُس کی تصویر کس طرح کھینچی ہے:۔

چھریرا بدن، نکلتی ہوئی گردن، مخروطی دُم اور گول گول آنکھوں میں ایک عجیب طرح کا بولتا ہوا بھولا پن۔ جب دانہ چگنے آئے گی تو ہر دانہ پر میری طرف دیکھتی جائے گی۔ ہم دونوں کی زبانیں خاموش رہتی ہیں مگر نگاہیں گویا ہوتی ہیں۔ وہ میری نگاہوں کی بولی سمجھنے لگی ہے اور میں نے اُس کی نگاہوں کو پڑھنا سیکھ لیا ہے۔ بہر حال اس موقعہ پر بھی اُس کی بیساختہ نگاہوں نے مجھ سے کچھ کہا اور پھر بغیر کسی جھجک کے جست لگا کر انگوٹھے کی جڑ

پر آکھڑی ہوئی اور دانوں پر چونچ مارنا شروع کر دیا۔ یہ چونچ
نہیں تھی نشتر کی نوک تھی جو اگر چاہتی تو ہتھیلی کے آر پار
ہو جاتی۔ مگر صرف چبر کے لگا لگا کر رک جاتی تھی۔

یک ناوک کاری زکماں تو نہ خوردم
ہر زخم تو محتاج بہ زخم دگرم کرد

ہر مرتبہ گردن موڑ کر میری طرف دیکھتی بھی جاتی گویا پوچھ
رہی تھی کہ درد تو نہیں ہوتا۔

مولانا کے ادب کا یہ تقریباً بالکل نیا پہلو ہے جس سے لوگ پہلی دفعہ
"غبار خاطر" ہی کے صفحات پر آشنا ہوئے ہوں گے۔ اور شاید خود مولانا
کی توجہ بھی اس چیزوں کی گرفت میں نہ آتی اگر وہ قید کی حالت میں نہ ہوتے
اور کتابیں اُن کو میسر ہوتیں اور وہ اپنے دوسرے علمی مشاغل کو جاری
رکھ سکتے۔ معلوم ہوتا ہے کہ مولانا کو جو یکسوئی حاصل تھی اُس نے اُن کی
قوت مشاہدہ کو دوسرے افکار پر حاوی کر دیا تھا۔ چنانچہ باغبانی کے مشاغل
میں بھی اُنہیں پھولوں کی طرف بھی شاعرانہ نظر سے دیکھنے کی مہلت دی۔
سرتختہ گل تاثرات کے جو نقوش اُن کی طبع حساس پر بنے ان کو کاغذ
پر اس طرح منتقل فرماتے ہیں:۔

سامنے دو تختوں میں زنیا
کے پھول رنگ برنگ کے صافے باندھے نمودار ہو گئے
زنیا کے پھول کئی رنگ کے ہوتے ہیں۔ یہ بڑے زنیا کے

پھول تھے۔ اُن کے صافوں کی لپیٹ آتنی مرتب اور مدور واقع ہوئی تھی کہ معلوم ہوتا تھا کہ کسی مشاق دستار بند نے قالب پر چڑھا کر پیچوں کی ایک ایک سلوٹ نکال دی ہے۔ جوں جوں عمر بڑھتی گئی صافوں کی ضخامت بھی بڑھتی گئی اور پھر تو ایسا معلوم ہونے لگا کہ جیسے پہرداروں کی صفیں رنگ برنگ کی پگڑیاں باندھے کھڑی ہیں اور زندانیان قلعہ کی طرح اس باغ نورستہ کی بھی پاسبانی ہو رہی ہے۔

اب پھولوں کے دوسرے تختہ کی طرف نظر جاتی ہے:۔

قدرت کے قلم صنعت کی یہ بھی عجیب کرشمہ سنجی ہے کہ پھولوں کے ورق اور تتلیوں کے پروں پر ایک ہی موقلم سے میناکاری کر دی اور ایک ہی رنگ کی دواتیں کام میں لائی گئیں۔ ان پھولوں کے اوراق کا مطالعہ کیجیئے تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے بڑے پھولوں کی کثرت سے کچھ بچ رہا تھا اُسے بھی ضائع نہیں کیا گیا اور قینچی سے تراش تراش کر ننھے ننھے پھولوں کے ورق بنائے۔

ایک دوسرے تختہ کی طرف آئیے:۔

گلوری اوسا سپربا Gloriosa Superba

کی شاخیں اب کلیوں سے لدی ہوئی ہیں اُن کا پھول پہلے

نیچے کی طرف کھلیگا پھر پیاز کی طرح الٹ جائے گا، پھر
فانوس کی طرح مدور ہونے لگے گا پھر تھوڑی دیر دم لینے
کے لئے رُک جائے گا اور پھر دیکھیئے تو جن منزلوں سے
گذرتا ہوا آیا تھا اُن ہی منزلوں سے گذرتا ہوا اُلٹے پاؤں
واپس ہونے لگے گا۔ واپسی میں پہلے فانوس کی اُلٹی
ہوئی شاخیں پھیل کر ایک پیانہ بنائیں گی، پھر اچانک یہ
پیالہ اُلٹ جائے گا گویا زندگی کے جام واژگون میں اب
کچھ باقی نہ رہا......
ادھر موسم ختم ہوا اُدھر اُنہوں نے بھی دنیا کو خیرباد
کہا۔ زندگی کا ایک ہی پیرہن اُن کے حصہ میں آیا تھا وہی
کفن کا کام بھی دے گا۔

مولانا اپنے مطالعہ فطرت میں جب زندگی کا فلسفہ بیان کرتے ہیں خواہ وہ انسانوں کی زندگی ہو یا پھولوں کی، تو اُن کے بیان میں سوز و گداز Pathos کی ایک جھلک ہر جگہ نظر آئے گی اور یہ آرٹسٹ کی وہی غمگین فطرت ہے جس کی طرف میں شروع میں اشارہ کرچکا ہوں اور آگے بھی کچھ لکھوں گا۔

۱۰

مولانا کی طبیعت اس سوز وگداز کے متعلق جس نے درحقیقت اُن کی فطری شعریت کے آغوش میں پرورش پائی میں جابجا اشارے کرتا جاتا ہوں یہ سوز وگداز کہیں بھاری پردے کے پیچھے اور کہیں ہلکے نقاب میں اپنا جلوہ دکھاتا ہے۔ لیکن طبیعت کی خودداری اور ضبط نے اُنہیں عوام کی سطح کے قریب نہیں آنے دیا۔ وہی ضبط اُن کے سوز وگداز کو بھی لبسا اوقات ظاہر ہونے سے روکتا ہے حتیٰ کہ وہ اُن کے فطری اور انسانی تقاضوں کا بھی مقابلہ کرتا ہے۔ وہ اس کمزوری کا اظہار اپنے شخصی وقار کے خلاف سمجھتے ہیں۔ تاہم زندگی کی نمود پر تبصرہ کرتے ہوئے وہ عام لہجے میں اپنے احساس کے اس سوز کو دبا بھی نہیں سکتے۔ ۱۳ء میں الہلال کے صفحات مولانا زندگی کی حسرتوں اور آرزوؤں کا ذکر یحییٰ برمکی کے ایک قصہ کے ساتھ یوں کرتے ہیں کہ:۔

یحییٰ برمکی نے صحرا میں ایک اعرابی کو دیکھا تھا کہ میدان سے پتھروں کے ٹکڑوں کو جمع کرتا ہے اور جب ایک ڈھیر جمع ہو جاتا ہے تو پھر ایک ایک ٹکڑے کو اٹھاتا ہے اور جہاں سے لایا تھا اسی طرف پھینکنے لگتا ہے

کیا انسانی ہستی کی پوری تاریخ اس مثال میں پوشیدہ نہ تھی؟ ہماری زندگیاں جن کے ہنگامہ حیات سے کارگاہ عالم میں شورش و کشمکش کے طوفان اُٹھتے ہیں غور کیجئے تو امید کے ایک تار عنکبوت اور حسرت کے ایک جلتے ہوئے تنکے سے زیادہ کیا ہستی رکھتی ہیں؟ ساری عمر دو ہی کاموں میں بسر کر دیتے ہیں۔ یا صحرائے دجلہ کے اعرابی کی طرح صبح تمنا میں امیدوں کے سنگریزے جمع کرتے ہیں یا پھر شام نامرادی میں جہاں سے لائے تھے وہیں پھینک دیتے ہیں کہ ہمیشہ کے لئے مدفون ہو جائیں۔

مثال یہ مری کوشش کی ہے کہ مرغ اسیر
کرے قفس میں فراہم خس آشیاں کیلئے

کارساز قدرت کی بھی کیا کرشمہ سازیاں ہیں۔ کچھ خاک اُمید کی لی اور کچھ خاکستر حسرت کی، دونوں کی آمیزش سے ایک پتلا بنایا اور انسان نام رکھکر اُسے اس ہنگامہ زار ارضی میں بھیج دیا۔ کبھی اُمید کی روشنی سے شگفتہ ہوتا ہے، کبھی ناامیدی کی تاریکی سے گھبرا جاتا ہے۔ کبھی دلوں کی بہار میں زمزمہ ساز نغمۂ انبساط

ہوتا ہے اور کبھی حسرت وافسوس کی خزاں میں امیدوں کی
پژمردہ پتیوں کو گنتا ہے، کبھی ہنستا ہے اور کبھی روتا ہے
کبھی رقص نشاط ہے اور کبھی سینہ کوبیٔ ماتم۔ ایک
ہاتھ سے جمع کرتا ہے اور دوسرے سے کھوتا ہے۔

مولانا کے وجود معنوی کا یہ غمگین پہلو یوں تو اُن کے ادب میں بہت دھندلا نظر آتا ہے، لیکن غبار خاطر کا ایک مکتوب ایسا بھی ہے جس میں شخصی تاثرات کا یہ پردہ کسی قدر اُٹھ گیا ہے اور ضبط کے سخت گیر دیوتا کی گرفت ڈھیلی ہوگئی ہے تاکہ مولانا کی یہ انسانی "کمزوری" کسی قدر ظاہر ہو جائے۔ یہ مکتوب وہ ہے جس میں مولانا نے اپنی اہلیہ کی علالت اور وفات کا ذکر کیا ہے۔ چونکہ تمام دوسرے مکاتیب کی طرح یہ مکتوب بھی اس خیال سے لکھا گیا تھا کہ وہ کبھی شائع نہ ہوگا اس لئے میرا گمان یہ ہے کہ مولانا نے زیادہ تر اپنے احساسات کی بےچینی کو رفع کرنے کے لئے اپنی فطرت کے اس نقاب کا ایک گوشہ اُٹھا دیا ہوگا۔ اگر ان مکتوبات کی اشاعت کا کوئی امکان بھی پیش نظر ہوتا تو شاید مولانا اپنے غم کی اس منزل میں جو کسی قدر کھلے ہیں اتنے بھی نہ کھلتے۔

مولانا کی زندگی میں شاید دو ہی ایسے بڑے حادثات گنائے جا سکتے ہیں جنہوں نے اُن کے ضبط وصبر کے قلعہ کی دیواروں کو ہلا دیا ہوگا یعنی ایک اپنی اہلیہ کی وفات اور ایک مہاتما گاندھی کا حادثہ۔ آخرالذکر کے متعلق مولانا کے قلم سے کوئی تحریر ایسی نہیں نکلی جس سے ہم اُن کے مجروح

احساسات کی جراحتوں کا اندازہ کر سکیں، لیکن غبار خاطر میں اپنی اہلیہ سے اپنی آخری ملاقات اور اُن کی وفات کا کچھ اس طرح ذکر کرتے ہیں کہ گویا ڈرتے ہیں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ضبط کے ضابطہ کی خلاف ورزی ہو جائے اور قلم سے کوئی ایسی بات نکل جائے جو اُن کے غم کو رسوا کر دے۔ اُس زمانہ کے حالات کا ذکر کرتے ہوئے جو گرفتاری سے پہلے بمبئی جاتے وقت پیدا ہو چکے تھے مولانا اپنے بیان کی سنجیدگی کو قائم رکھنے کی کوشش فرماتے ہوئے، مرحومہ کا ذکر اس طرح کرتے ہیں کہ

وہ جانتی تھی کہ اس طرح کے حالات میں ہمیشہ میری خاموشی بڑھ جاتی ہے اور میں پسند نہیں کرتا کہ اُس خاموشی میں خلل پڑے۔ اسی لئے وہ بھی خاموش تھی لیکن ہم دونوں کی یہ خاموشی بھی گویائی سے خالی نہ تھی ہم دونوں خاموش رہ کر بھی ایک دوسرے کی باتیں سُن رہے تھے اور اُن کا مطلب اچھی طرح سمجھ رہے تھے۔ ۳ اگست کو جب میں بمبئی کے لئے روانہ ہونے لگا تو وہ حسب معمول دروازہ تک خدا حافظ کہنے کے لئے آئی۔ میں نے کہا کہ اگر کوئی نیا واقعہ پیش نہ آ گیا تو ۱۳ اگست تک واپسی کا قصد ہے۔ اُس نے خدا حافظ کے سوا اور کچھ نہیں کہا۔ لیکن اگر وہ کہنا بھی چاہتی تو اُس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکتی جو

اُس کے چہرہ کا خاموش اضطراب کہہ رہا تھا۔ اُس کی آنکھیں خشک تھیں مگر چہرہ اشکبار تھا۔

خود را بحیلہ پیش تو خاموش کردہ ایم

وہ میری طبیعت کی افتاد سے اچھی طرح واقف تھی وہ جانتی تھی کہ اس طرح کے موقعوں پر اگر اُس کی طرف سے ذرا بھی اضطراب طبع کا اظہار ہوگا تو مجھے سخت ناگوار گذرے گا۔ اور عرصہ تک اُس کی تلخی ہمارے تعلقات میں باقی رہے گی۔ ۱۶ء میں جب پہلی مرتبہ گرفتاری پیش آئی تھی تو وہ اپنا اضطراب خاطر نہیں روک سکی تھی اور میں عرصہ تک اُس سے ناخوش رہا تھا۔

اب سوچتا ہوں تو خیال آتا ہے کہ شاید اُسے صورتِ حال کا ایک مجہول احساس ہونے لگا تھا۔ شاید وہ محسوس کر رہی تھی کہ اس زندگی میں یہ ہماری آخری ملاقات ہے وہ خدا حافظ اس لئے نہیں کہہ رہی تھی کہ میں سفر کر رہا تھا۔ وہ اس لئے کہہ رہی تھی کہ خود سفر کرنے والی تھی۔

سوز و گداز کے اس دبے دبے اور سہمے سہمے مظاہرے میں بھی

سب سے زیادہ جو چیز عیاں ہے وہ مولانا کی انفرادیت ہے جو زن وشو کے تعلقات پر بھی حاوی معلوم ہوتی ہے۔ اور جس کو وہ اپنی غمگین یادوں میں بھی چھپا نہیں سکتے۔ ضبط و تحمل بھی اسی انفرادیت کے سرافراز وقار کی گویا ایک بناوٹ ہے۔ اس حقیقت کو خود بھی تسلیم کرتے ہیں۔ "خطرناک صورت حال" کی اطلاع ملتی ہے اُنہوں نے اپنے دل کو ٹٹولا اور اس جستجو میں جو کچھ پایا وہ یہ ہے:۔

انسان کے نفس کا بھی عجب حال ہے۔ ساری عمر ہم اس کی دیکھ بھال میں صرف کر دیتے ہیں، پھر بھی یہ معمہ حل نہیں ہوتا۔ میری زندگی ابتداء سے ایسے حالات میں گذری کہ طبیعت کو ضبط و انقیاد میں لانے کے متواتر موقع پیش آئے اور جہاں تک ممکن تھا اُن سے کام لینے میں کوتاہی نہیں کی . . . . .

تاہم میں نے محسوس کیا کہ طبیعت کا سکون ہل گیا ہے اور اسے قابو میں رکھنے کے لئے جد وجہد کرنی پڑے گی یہ جد وجہد دماغ ہی کو نہیں بلکہ جسم کو بھی تھکا دیتی ہے۔ وہ اندر ہی اندر گھلنے لگتا ہے۔

اس زمانہ میں میرے دل و دماغ کا جو حال رہا میں اُسے چھپانا نہیں چاہتا۔ میری کوشش تھی کہ اس صورت حال کو پورے صبر و سکون کے ساتھ برداشت

کردں۔ اُس میں میرا ظاہر کامیاب ہوا لیکن باطن نہ ہو سکا
میں نے محسوس کیا کہ اب دماغ بناوٹ اور نمائش
کا وہی پارٹ کھیلنے لگا ہے جو احساسات اور انفعالات
کے ہر گوشہ میں ہم کھیلا کرتے ہیں اور اپنے ظاہر کو
باطن کی طرح نہیں بننے دیتے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
قرار و سکون کی یہ جو کچھ نمائش تھی جسم و صورت کی
تھی، قلب و باطن کی نہ تھی۔ جسم کو میں نے بکھرنے سے بچا لیا
مگر دل کو نہیں بچا سکا۔
جسم و جان کی اس کشمکش کی طرف چند اور اشارے بھی کئے ہیں:۔
رات ایک ایسی حالت میں کٹی جسے نہ اضطراب سے تعبیر کر سکتا
ہوں اور نہ سکون سے۔ آنکھ لگ جاتی تھی تو سکون تھا
کھل جاتی تھی تو اضطراب تھا۔ گویا ساری رات دو متضاد
خوابوں کے دیکھنے میں بسر ہو گئی۔ ایک تعمیر کی نقش آرائی
کرتا تھا دوسرا تخریب کی برہم زنی۔
پھر وفات کی خبر آنے کے بعد:۔
سب سے پہلے یہ کوشش کرنی پڑی کہ یہاں زندگی کے
جو معمولات ٹھہرائے جا چکے ہیں اُن میں فرق نہ آنے پائے
چا ، اور کھانے کے چار وقت میں مجھے اپنے کمرے سے
نکلنا اور کمروں کی قطار کے آخری کمرے میں جانا پڑتا ہے

چونکہ زندگی کے معمولات میں وقت کی پابندی کا منٹوں کے
حساب سے عادی ہوگیا ہوں اس لئے یہاں بھی اوقات
کی پابندی کی رسم قائم ہوگئی اور تمام ساتھیوں کو بھی اُس کا
ساتھ دینا پڑا .... یہ سب کچھ
بدستور ہوتا رہا۔

قلب و روح کے تاثر کی حالت ایک مثال کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ بہت سال پہلے کا یہ واقعہ یاد آتا ہے کہ ایک غبارے کی گیس سوئی چھید کر نکالی تھی اور اُس سے جو ایک آواز "سی" کی طرح نکلی تھی اُس کا قلب پر عجیب اثر ہوا تھا۔ فرماتے ہیں کہ

یقین کیجیئے کہ آجکل بعینہٖ ایسا ہی حال اپنے سینہ کا بھی محسوس کرتا ہوں۔ غبارے کی طرح اُس میں بھی کوئی پرجوش عنصر ہے جو بھر گیا ہے اور نکلنے کے لئے بیتاب ہے۔ اگر اگر کوئی ہاتھ ایک سوئی اُٹھا کر چبھودے تو مجھے یقین ہے کہ اس میں سے بھی ویسا جوش امنڈ کر اُچھلیگا جس طرح غبارہ سے ایک مضطرب چیخ کے ساتھ اُچھلا تھا۔

یہ گویا انتہا ہے اُس خلاف ورزی کی جو مولانا نے ضبط و تحمل کے قواعد و ضوابط کی صرف ایک دفعہ اپنی زندگی کے اس شخصی حادثہ کے متعلق گوارا کرلی! اس بناوٹ کو وہ تسلیم کرتے ہیں کہ اُنہوں نے اس موقعہ پر

اپنے ظاہر کو باطن سے متاثر نہ ہونے دیا۔ لیکن اُن کی خود بیں انفرادیت اس بات کو شاید تسلیم نہ کرے کہ یہ بناوٹ اور ظاہرداری بھی انسانیت کے تقاضوں میں سے ایک ہے۔ اس قسم کی انفرادیت جسے کوئی رشوت نہ دی جا سکے اور جو مولانا کی ہے شاید کبھی اپنا یہ فرض تسلیم نہیں کرتی کہ اُسے انسانیت کے بعض غیر انفرادی تقاضوں کو پورا کرنا چاہیئے! وہ ایسے عمل کو خود اپنے وقار کے خلاف ایک بغاوت سمجھتی ہے! مولانا کی غمگین فطرت بھی اسی لئے برسرِعام اپنی غمگینی کا اعتراف کرنا پسند نہیں کرتی۔ یہ تشدد پسند خودداری جو بجائے خود ایک نفسیاتی آمریت ہے ایک لمحہ کے لئے بھی گوارا نہیں کرتی کہ کمتر انسانوں کی نظر میں اس کا وزن ایک ذرہ بھی کم ہو جائے۔

مولانا کا یہ سوز و گداز اُن کے فلسفہ سود و زیاں کے ساتھ ایک تسکین بخش توازن بھی پیدا کر لیتا ہے۔

غور کیجیئے تو یہاں کی ہر بناوٹ کسی نہ کسی بگاڑ ہی کا نتیجہ ہے۔ یا یوں کہیئے کہ یہاں کا ہر بگاڑ دراصل ایک نئی بناوٹ ہے۔

بگڑنے پر بھی زُلف اُس کی بنا کی

میدانوں میں گڑھے پڑ جاتے ہیں، اینٹوں کا پزاوہ بھر جاتا ہے، درختوں پر آریاں چلنے لگتی ہیں اور جہاز بن کر تیار ہو جاتے ہیں۔ سونے کی کانیں خالی ہو گئیں

لیکن ملک کا خزانہ دیکھیئے تو اشرفیوں سے بھرپور ہو
رہا ہے۔ مزدور نے اپنا پسینہ سر سے پاؤں تک بہا
دیا مگر سرمایہ دار کے راحت وعیش کا سر و سامان درست
ہو گیا۔ ہم مالی کی جھولی بھری دیکھ کر خوش ہونے لگتے ہیں
مگر ہمیں یہ خیال نہیں آتا کہ کسی کے باغ کی کیاری اُجڑی
ہو گی تب ہی جھولی معمور ہوئی۔

سود و زیاں کا یہ سنجیدہ فلسفہ اگر سوز و گداز کی بے اختیاریوں کا پردہ نہیں ہے تو وہ ایسے طبائع کے لئے ایک تسکین بخش علاج ہے جن کی خودی Ego اپنے مرکز پر اس بات کا اظہار کرنا کسر شان سمجھتی ہے کہ وہ جذبات سے متاثر ہوئی۔

۱۱

لیکن بجائے خود ایک بے پناہ جذبہ ہے اور اس جذبہ کے تحت "خودی" اپنا ایک ایسا مرکز بنا لیتی ہے جس میں زندگی کا سب سے بڑا عنصر یعنی مذہب بھی تزلزل پیدا نہیں کر سکتا۔ مولانا کی

انفرادیت کو اگر اُن کے مذہبی احساسات کے آئینہ میں دیکھا جائے تو ادھر بھی مولانا کی راہ دوسروں سے بالکل جدا ہے۔ اُن کی مذہبی زندگی کا پس منظر اُن کی خاندانی روایات اور وہ ابتدائی تربیت ہے جو اِن روایات کے ماحول میں انہیں حاصل ہوئی۔ تذکرہ اور غبارِ خاطر کے اوراق میں مولانا نے اپنی خاندانی روایات اُن کے ردعمل اور اُن کے اثرات کا ذکر کیا ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ کس طرح اُس مذہبی فضا میں اُنہوں نے تربیت پائی اور پھر کس طرح قدامت کی راہوں سے الگ اُنہوں نے اپنے لئے ایک راستہ پیدا کیا۔ فرماتے ہیں کہ

> یہاں سوال عادات و خصائل کا نہیں ہے۔ افکار و حالات کا ہے اور جب اس اعتبار سے اپنی حالت کا جائزہ لیتا ہوں تو خاندانی تعلیم اور ابتدائی گرد و پیش کا کوئی گوشہ بھی میل کھاتا ہوا دکھائی نہیں دیتا۔ فکری موثرات کے جتنے بھی اصول و ظرف ہو سکتے ہیں اُن میں سے ایک ایک کو اپنے سامنے لاتا ہوں اور پھر ایک میں اپنے کو ڈھونڈتا ہوں مگر اپنا سراغ کہیں نہیں ملتا . . . . فرض کیجیے کہ میرے قدم اُسی منزل میں رُک گئے ہوتے اور علم و فضل کی جو راہیں آگے چل کر ڈھونڈی گئیں اُن کی لگن نہ پیدا ہوئی ہوتی تو میرا کیا حال ہوتا۔ ظاہر ہے کہ تعلیم کا

یہ ابتدائی سرمایہ مجھے ایک جامد اور نا آشنائے حقیقت
دماغ سے زیادہ اور کچھ نہیں دے سکتا تھا۔

مولانا کی انفرادیت جس طرح سیاسی زندگی میں عوامی زندگی سے قریب رہ کر بھی ہمیشہ دُور رہی اسی طرح مذہبی زندگی میں بھی مولانا تقلیدی عقائد رکھنے والے گروہ سے قریب رہ کر بھی دراصل تقلیدی عقائد سے بیزار رہے۔ تقلید کی اس عام گرفت کا شکوہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ:-

انسان کی دماغی ترقی کی راہ میں سب سے بڑی روک اُس کے تقلیدی عقائد ہیں۔ اُسے کوئی طاقت اس طرح جکڑ بند نہیں کر دے سکتی جس طرح تقلیدی عقائد کی زنجیریں کر دیا کرتی ہیں۔ وہ ان زنجیروں کو توڑ نہیں سکتا اس لئے کہ توڑنا چاہتا ہی نہیں۔ وہ انہیں زیور کی طرح محبوب رکھتا ہے۔ ہر عقیدہ ہر عمل، ہر نقطۂ نگاہ جو اُسے خاندانی روایات اور ابتدائی تعلیم و صحبت کے ہاتھوں مل گیا ہے اُس کے لئے ایک مقدس ورثہ ہے۔ وہ اس ورثہ کی حفاظت کرے گا مگر اُسے چھُونے کی جراُت نہیں کرے گا بسا اوقات موروثی عقائد کی پکڑ اس قدر سخت ہوتی ہے کہ تعلیم اور گرد و پیش کا اثر بھی اُسے ڈھیلا نہیں

کر سکتا۔ تعلیم دماغ پر ایک نیا رنگ چڑھا دے گی لیکن
اُس کی بناوٹ کے اندر نہیں اُترے گی۔ بناوٹ کے
اندر ہمیشہ نسل و خاندان اور صدیوں کی متوارث روایات
ہی کا ہاتھ کام کرتا رہیگا۔

تقلیدی عقائد کے متعلق مولانا کا یہ زاویہ نظر ہندستان کے علما کے زاویہ نظر سے بہت مختلف ہے۔تاہم مولانا نے اپنے خاندان کے علم و فضل کی بعض روایات کو بنیاد بنا کر اُس پر ایک جدید عمارت قائم کی ہے وہ تذکرہ میں اپنے اسلاف کی بعض روایات کو اپنے لئے باعث فخر قرار دیتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ

بلاشبہ اس کو اللہ تعالیٰ کا فضل و کرم یقین کرتا ہوں
کہ مجھکو ایک ایسے خاندان میں پیدا کیا . . . . . .
اور بلاشبہ اسلاف کے ورثہ علم و حق پرستی کو دنیا
کی ہر نعمت سے زیادہ عزیز رکھتا ہوں اور نہیں چاہتا
کہ کبھی اس نشہ سے میرا دماغ خالی ہو۔

لیکن یہ کوئی تقلیدی جذبہ یا خاندانی عقائد کی پابندی کا سوال نہیں ہے بلکہ جن خاندانی خصوصیات کے نشہ سے مولانا اپنے دماغ کو خالی نہیں رکھنا چاہتے، وہ

حق گوئی و حق پرستی اور طریق استقامت اور عشق حق
میں سرفروشی و جان سپاری اور مغروران تاج و تخت

اور بندگان مال وجاہ کے مقابلہ میں بے نیازی و
سرگرانی۔

کی خصوصیات ہیں جن کو وہ اپنی انفرادیت کا طرۂ امتیاز بناتے ہیں۔ تذکرہ کے اوراق میں تو مولانا نے اپنی شخصی زندگی کا حال اتنا بھی نہیں لکھا جتنا کہ ہم غبارِ خاطر کے اوراق سے اخذ کر سکتے ہیں لیکن اپنے خاندان کے مشاہیر کے اُن کارناموں کا بہت کچھ ذکر فرمایا ہے جنہوں نے " حق " کے لئے بادشاہوں اور امراء اور اُس زمانہ کے علمائے سؤ کا مردانہ وار مقابلہ کیا۔ تذکرہ درحقیقت ایک ایسا چوکھٹا ہے جسمیں مولانا نے اپنے اسلاف کی زندگی کو اپنی تصویر کا پس منظر بنایا ہے۔ لیکن خود اپنی تصویر کے خدوخال کچھ زیادہ واضح نہیں کئے۔ ان اذکار میں مولانا " ارباب صدق وصفا " کی زندگی کا جو تصور پیش کرتے ہیں وہی فی الاصل ایک سانچہ ہے جس میں وہ بتانا چاہتے ہیں کہ خود اُن کی زندگی ڈھالی گئی ہے۔

ارباب صدق وصفا ہمیشہ قید وطن و دیار سے آزاد رہے خدا کی ساری خدائی اُن کا وطن اور ساری زمین اُن کا گھرانا ہے۔ جن بے نیازان دنیا اور نیازمندان حق کو وطن میں رہ کر بھی ناز و نعمت دنیوی کے مزے نہیں لوٹنے ہیں بلکہ اپنے بوریائے فقر پر قانع رہ کر علم و عشق کی خدمت و چاکری کرنی ہے اُن کے لئے دنیا کے

کسی ایک گوشہ میں کیا دھرا ہے جو دوسرے گوشہ میں
میسر نہ آئے گا . . . . اُن کے
علم وحق کی جنس تو وہ متاع عالمگیر ہے جس کے لیئے
خدائی کی ساری دنیا بازار کا حکم رکھتی ہے۔ وہ اپنی
جھولی میں حق وصداقت کا تخم رکھتے ہیں اور اس کو لیکر جس
سرزمین جانکلیں گے اپنی فصل وکاشت خود تیار
کرلیں گے۔

علم وفضل اورحق پرستی کی اسی شان استغنا اور بے نیازی
کو الہلال میں اس طرح بیان فرماتے ہیں:۔

دعوت و اعلان حق کا کام کرنے والوں کو اپنے لئے نہیں
مگر اپنے کام کی عزت کی خاطر بادشاہوں کی سی نظر اور
اورکشورستانوں کا سا دماغ رکھنا چاہیئے۔ جولوگ خدا
کے دروازے کے سائل ہیں دنیا میں کس کی ہستی ہے
کہ وہ اُنہیں اپنے سامنے سائل دیکھ سکے۔ اُن کی جیب
میں ایک کھوٹا سکہ بھی نہ ہو لیکن اُن کے دل میں وہ خزانہ
مخفی ہے جس سے بڑے بڑے مغرور شہنشاہوں کو
خرید سکتے ہیں۔ دولت اور ریاست دنیوی اس لئے
بنائی گئی ہے تاکہ اپنے آپ کو اُن کے آگے ڈالدے
اور وہ اُسے ٹھکراکر عزت بخشیں۔ اگر وہ ایسا کریں تو

دولت کے پجاریوں کے لئے یہی سب سے بڑا شرف ہے کیونکہ اِن کے پاس جو کچھ ہے وہ ختم ہوجائے گا یا چھین لیا جائے گا پر اُن کے پاس جو خزانہ ہے وہ نہ تو کبھی ختم ہوگا نہ اس آسمان کے نیچے اُسے کوئی چھین سکتا ہے۔

ایک اور موقعہ پر الہلال میں علم وفضل کی اس بے نیازی کی طرف اشارہ کرتے ہیں:۔

پس قلم خاموش ہیں، زبانیں سی دی گئی ہیں، حق کی جراتیں طمع وحرص کے منذر پر قربان ہورہی ہیں اور وہ خدا کی سچائی جس کی قیمت میں کرہ ارض کے تمام خزائن بھی ہیچ تھے اور اس کے رسولوں اور نبیوں کی پاک امانت بھی چاندی سونے کے سکوں پر فروخت کی جارہی ہے . . . . حالانکہ خدائے عزیز وبرتر کا کچھ اس طرح فضل وکرم ہے کہ جس چیز کے پیچھے لوگ چیختے چلّاتے گرتے پڑتے گردوخاک میں لوٹتے ہوئے دوڑتے ہیں مگر پھر بھی نہیں ملتی وہ میرے لئے بغیر میری ادنیٰ طلب وخواہش کے موجود ہے اور اگر میں چاہوں تو اپنی جگہ سے ہلے بغیر اپنے دامن حرص وآز میں اُسے ہر وقت مہیا دیکھ سکتا ہوں

لیکن الحمداللہ کہ سائل کی جگہ معطی بننے کی لذت سے دل کچھ
اس طرح آشنا ہوگیا ہے کہ جو ہاتھ اپنے سامنے پھیلے
ہاتھوں کو دے سکتا ہے اُسے دوسروں کے آگے لینے
کے لئے کبھی پھیلا نہیں سکتا . . . . .

مولانا نے اپنے خاندان کی روایات میں بھی سب سے زیادہ علم و فضل کی اسی شان استغنا اور بے نیازی کو نمایاں کیا ہے۔ اپنے سلسلہ خاندان کے جن مشاہیر علماء کے کارناموں کا مولانا نے ذکر فرمایا ہے اُن میں سے ایک حضرت مولانا جمال الدین معروف بہ شیخ بہلول دہلوی تھے جنہوں نے اکبر کی امامت کے محضر پر دستخط کرنے سے انکار کردیا تھا تذکرہ میں مولانا نے اس واقعہ کا اور اس زمانہ کے علماء سوٗ کی بداعمالیوں کا بہت ہی دلچسپ پیرایہ میں ذکر کیا ہے۔ لیکن یہ ساری داستان اس طرح لکھی گئی ہے کہ پڑھنے والا اُس کے نقش و نگار میں خود مولانا کے افکار و عزائم کی ایک دنیا آباد پاتا ہے۔ مولانا کے ادب کا یہ ایک خاص انداز ہے کہ جب وہ دوسروں کا ذکر کرتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خود اُن کی شخصیت بالمقابل ہے۔

اپنے خاندانی علماء اور اُن کے معاصرین کی روایات کا ذکر کرتے ہوئے مولانا قدیم روایات اور رسم و راہ کی گرفت سے اپنی آزادی پر خود حیران ہوتے ہیں اور اس کو اشارتاً فطرت کے ایک استثنا سے منسوب کرتے ہیں:-

سوال یہ ہے کہ تمام حالات اور موثرات کے خلاف

طبیعت کی یہ اُفتاد کیونکر بنی اور کہاں سے آئی۔ خاندانی
افکار و عقاید کا جو سانچا ڈھالنا چاہتا تھا نہ ڈھال سکا۔
تعلیم جس طرف لیجانا چاہتی تھی نہ لے جا سکی۔ حلقۂ صحبت
اثرات کا جو تقاضہ تھا وہ پورا نہ ہوا۔ اس عالم اسباب
میں ہر حالت کا دامن کسی نہ کسی عقیدہ سے بندھا ہوتا ہے
آخر اس رشتہ کا بھی کوئی سرا ملنا چاہیئے۔ واقعہ یہ
ہے کہ نہیں ملتا۔ ممکن ہے کہ یہ میری نظر کی کوتاہی ہو
اور کوئی دوسری دقیقہ سنج نگاہ حالات کا مطالعہ کرے
تو کوئی نہ کوئی محرک ڈھونڈھ نکالے مگر مجھے تو تھک کر
دوسری ہی طرف دیکھنا پڑتا ہے۔

مولانا نے اپنی تحریروں میں کہیں جامعہ ازہر میں اپنی طالب علمانہ زندگی کا تفصیلی ذکر نہیں کیا ہے۔ لیکن جیسا کہ ان صفحات میں پہلے بھی اشارہ کیا جا چکا ہے یہ بہت ممکن ہے کہ قدیم عقاید سے مولانا کی آزادی کا آغاز علماء ازہر کے اس مکتب خیال کے اثرات سے ہوا ہو جو جمال الدین افغانی اور مفتی عبدہ کے سلسلہ درس کی ایک کڑی ہے۔ یہ سلسلہ ازہر میں آج تک جاری ہے۔ لیکن اگر یہ گمان بھی صحیح نہیں تو پھر تو "تھک کر دوسری ہی طرف دیکھنا پڑتا ہے"۔

اس میں کیا کلام ہے کہ بحیثیت ایک مفکر اور قائد افکار کے مولانا کی زندگی کا اساس مذہبی رہا ہے۔ اُن کے علم و فضل کا سنگ بنیاد بھی

مذہب کا علم وعرفان ہے۔ اُن کی ذہنی تربیت کی ابتدائی منزلیں بھی مذہب کے قدیم ماحول میں گذری ہیں اور اب بھی جبکہ اُن کا مقام بہت بلند ہے اُن کی شخصیت کا مذہبی اور علمی پہلو ہی اُن کے شخصی اثرات کا سب سے زیادہ وزنی عنصر ہے۔ اُنہوں نے جس سمت میں مذہبی افکار کا ایک بلند آئیڈیل پایا اُس کا ذکر وہ خود ان الفاظ میں کرتے ہیں:۔

معلوم ہوا کہ اختلاف ونزاع کی اِن ہی متعارض راہوں میں اور خیالات واوہام کی ان ہی گہری تاریکیوں کے اندر ایک روشن اور قطعی راہ بھی موجود ہے جو یقین اور اعتقاد کی منزل تک چلی گئی ہے۔ . . . . . . جبتک موروثی عقاید کے جمود اور تقلیدی ایمان کی چشم بندیوں کی پٹیاں ہماری آنکھوں پر بندھی رہتی ہیں ہم اس راہ کا سراغ نہیں پا سکتے۔ لیکن جوں ہی پٹیاں کھلنے لگتی ہیں صاف دکھائی دینے لگتا ہے کہ راہ نہ تو دور تھی اور نہ کھوئی ہوئی تھی۔ یہ خود ہماری چشم بندی تھی جس نے ہمیں عین روشنی میں گم کر دیا تھا . . .

. . . . . .

مذہب اور عقیدہ کا تصور وہ اس طرح پیش فرماتے ہیں:۔

ایک مذہب تو موروثی مذہب ہے کہ باپ دادا جو کچھ مانتے رہے ہیں مانتے رہیئے۔ ایک جغرافی مذہب ہے

کہ زمین کے کسی خاص ٹکڑے میں ایک شاہراہ عام بن گئی۔ سب اُسی پر چلتے رہے ہیں اور آپ بھی چلتے رہیئے۔ ایک مردم شماری کا مذہب ہے کہ مردم شماری کے کاغذات میں ایک خانہ مذہب کا بھی ہوتا ہے۔ اس میں "اسلام" درج کرا دیجیئے۔ ایک رسمی مذہب ہے کہ رسموں اور تقریبوں کا ایک سانچہ ڈھل گیا ہے، اُسے نہ چھیڑیئے اور اسی میں رہتے رہیئے۔ لیکن ان تمام مذہبوں کے علاوہ بھی مذہب کی ایک حقیقت باقی رہ جاتی ہے۔ تعریفِ امتیاز کے لیئے اُسے حقیقی مذہب کے نام سے پکارنا پڑتا ہے اور اُسی کی راہ گم ہو جاتی ہے۔

ہمیں ورق کہ سیہ گشت مدعا اینجا ست

اس مقام پر پہنچ کر یہ حقیقت بے نقاب ہوتی ہے کہ علم و مذہب کی جتنی نزاع ہے وہ فی الحقیقت علم و مذہب کی نہیں ہے۔ مدعیان مذہب کی خام کاریوں ظاہر پرستیوں اور قواعد سازیوں کی ہے۔ حقیقی علم اور حقیقی مذہب اگرچہ چلتے ہیں الگ الگ راستوں سے مگر بالآخر پہنچ جاتے ہیں ایک ہی منزل پر۔

ایمان کی اس منزل کو مولانا ان الفاظ میں بیان فرماتے ہیں:-

فلسفہ شک کا دروازہ کھول دے گا اور پھر اُسے بند نہیں کر سکیگا۔ سائنس ثبوت دیگا مگر عقیدہ نہیں دے سکیگا۔ لیکن مذہب عقیدہ دے دیتا ہے اگرچہ ثبوت نہیں دیتا اور یہاں زندگی بسر کرنے کے لئے صرف ثابت شدہ حقیقتوں ہی کی ضرورت نہیں بلکہ عقیدہ کی بھی ضرورت ہے۔ ہم صرف اُن ہی باتوں پر قناعت نہیں کر لے سکتے جنہیں ثابت کر سکتے ہیں اور اسی لئے مان لیتے ہیں۔ ہمیں کچھ باتیں ایسی بھی چاہئیں جنہیں ثابت نہیں کر سکتے مگر مان لیتے ہیں۔

گو کہ اس قسم کے مباحث اس کتاب کے موضوع سے خارج ہیں لیکن مذہب کے بارے میں مولانا کے اجتہادات اور تصورات کا ایک گوشہ دیکھ لینا مولانا کی مجتہدانہ انفرادیت کو سمجھ لینے کے لئے ضروری ہے۔ اپنے اجتہاد کے مقابلہ میں وہ مذہب اور اہل مذہب کے رائج الوقت توہمات کو حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں، جس کی چند مثالیں بعد میں پیش کی جائیں گی۔

خدا کے متعلق مولانا کا بنیادی تصور اُن ہی کے الفاظ میں کچھ اس طرح ہے کہ:۔

طلسم ہستی کے معمہ پر غور کیجیئے جو خود ہمارے اندر اور ہمارے چاروں طرف پھیلا ہوا ہے۔ انسان نے جب

ہوش و آگہی کی آنکھیں کھولیں وہ اسی معمہ کا حل ڈھونڈھ رہا ہے۔ لیکن اس پرانی کتاب کا اول و آخر ورق کچھ اس طرح کھو گیا ہے کہ نہ تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ شروع کیسے ہوئی تھی اور نہ اسی کا کچھ سراغ ملتا ہے کہ ختم کہاں جاکر ہوئی اور کیونکر ہوگئی۔ . . . . دوسری طرف ہم محسوس کرتے ہیں کہ ہمارے اندر ایک نہ بجھنے والی پیاس کھول رہی ہے جو اس معمہ ہستی کا کوئی حل چاہتی ہے۔

اب قفل ابجد کی مثال پیش کرتے ہیں کہ اس معمہ کا راز خود اسی کے اندر موجود ہے اور اسی کے حرفوں کی نشست میں محفوظ ہے۔ شرط یہ ہے کہ وہ حروف معینہ ترتیب میں قائم ہوجائیں۔ فرماتے ہیں کہ:

اگر جسم میں روح بولتی ہے اور لفظ میں معنے ابھرتے ہیں تو حقائق ہستی کے اجسام بھی اپنے اندر کوئی روح معنے رکھتے ہیں۔ یہ حقیقت کہ ہستی کے بے جان اور بے معنی جسم میں صرف کسی ایسے حل ہی سے روح معنی پیدا ہوسکتی ہے ہمیں مجبور کردیتی ہے کہ اس حل کو تسلیم کرلیں۔

یعنی اس ابجد کی "روح معنی" ہی وہ خدا ہے جس کی ہمیں تلاش ہے اس تلاش حق کے متعلق فرماتے ہیں کہ

اگر کوئی ارادہ اور مقصد پردے کے پیچھے نہیں ہے تو یہاں تاریکی کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ لیکن اگر ارادہ اور مقصد کام کر رہا ہے تو پھر جو کچھ بھی ہے روشنی ہی روشنی ہے۔ ہماری فطرت میں روشنی کی طلب ہے ہم اندھیرے میں کھوئے جانے کی جگہ روشنی میں چلنے کی طلب رکھتے ہیں اور ہمیں یہاں روشنی کی راہ صرف اسی ایک حل سے مل سکتی ہے . . . . . .

. . خدا کی ہستی کا عقیدہ انسان کے ایک فطری احتیاج کے تقاضے کا جواب ہے اور چونکہ فطری تقاضے کا جواب ہے اس لئے اس کی جگہ انسان کے اندر پہلے ہی سے موجود ہونی چاہیئے۔

اے تیر غمت را دل عشاق نشانہ
خلقے بہ تو مشغول تو غایب زمیانہ
گہ معتکف دیرم وگہ ساکن کعبہ
یعنی کہ ترا می طلبم خانہ بخانہ

اس کے بعد مولانا نے بتایا ہے کہ مختلف قوموں نے مختلف رنگوں میں

اس تصور کے اندر رنگ آمیزی کی اور اس طرح اُس کے متعلق مختلف فلسفے تیار ہو گئے۔ خود مولانا کے عقیدہ میں تصوف کا ایک خاص رنگ نمایاں ہے جس کو انہوں نے مادہ کی بحث میں پیش فرمایا ہے۔

قدامت پرست اور کم استعداد اہل مذہب کو مولانا حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں اور اس انداز تحقیر میں مولانا کی انفرادیت اپنا جلوہ دکھاتی ہے۔ تذکرہ کے اوراق پر اپنے اسلاف میں علمائے حق کا ذکر فرماتے ہوئے اُس زمانہ کے علماء سو پر سختی کے ساتھ تنقید فرماتے ہیں اور تاریخی حقائق کی روشنی میں دکھلاتے ہیں کہ کس طرح ان علمائے سو نے شریعت اور عقاید حسنہ کو اپنی تاویلوں اور اپنے حیلوں کا نشانہ بنایا تھا۔ یہ لوگ حیلہ شرعی کے زور سے زنا کو جائز بنا دیتے تھے اور زکوٰۃ کے احکام سے بچنے کے پہلو نکال لیا کرتے تھے۔ اُس کی متعدد مثالیں پیش کر کے فرماتے ہیں کہ:-

> یہی صورت حال آج بھی درپیش ہے۔ مذہب کے دوکانداروں نے جہل و تقلید و تعصب و ہوا پرستی کا نام مذہب رکھدیا ہے۔ اور روشن خیالی اور تحقیق جدید کے عقل فروشوں نے الحاد و بے قیدی کو حکمت واجتہاد کے لباس فریب سے سنوارا ہے۔ نہ مدرسہ میں علم ہے اور نہ محراب مسجد میں اخلاص۔ اور نہ میکدہ میں رندان بے ریا۔ ارباب صدق وصفا سب سے الگ ہیں اور

سب سے پناہ مانگتے ہیں۔ اُن کی راہ دوسری ہے

ہم کعبہ و ہم بتکدہ سنگ رہ ما بود
رفتیم و صنم بر سر محراب شکستیم

مولانا اہل مذہب کی قدامت پرستی اور تجدد پرستوں کی عقلیت دونوں سے الگ اپنی ایک راہ نکالتے ہیں۔ اہل مذہب کی ثقالت طبع کا شکوہ کرتے ہیں:۔

مذہب اور روحانیات کی دنیا میں تو زہد خشک اور طبع خنک کی اتنی گرم بازاری ہوئی کہ اب زہد مزاجی اور حق آگاہی کے ساتھ کسی ہنستے ہوئے چہرہ کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ دینداری اور ثقالت طبع تقریباً مرادف الفاظ بن گئے ہیں۔

ایسے لوگوں کے عقائد باطلہ اور اوہام کو اس طرح ہدف طنز بناتے ہیں کہ:۔

۱۸ ویں صدی کے اواخر میں جب نپولین نے مصر پر حملہ کیا تو مراد بک نے جامعہ ازہر کے علما کو جمع کر کے اُن سے مشورہ کیا کہ اب کیا کرنا ہے۔ علما ازہر نے بالاتفاق یہ رائے دی کہ جامعہ ازہر میں صحیح بخاری کا

ختم شروع کر دینا چاہیئے کہ انجام مقاصد کے لئے
تیر بہدف ہے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ لیکن ابھی صحیح
بخاری کا ختم ختم نہیں ہوا تھا کہ اہرام کی لڑائی نے
مصری حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۱۹ ویں
صدی کے اوائل میں جب روسیوں نے بخارا کا
محاصرا کیا تو امیر بخارا نے حکم دیا کہ تمام مدرسوں اور
مسجدوں میں ختم خواجگان پڑھا جائے۔ ادھر روسیوں
کی قلعہ شکن توپیں شہر کا حصار منہدم کر رہی تھیں اور
اُدھر لوگ ختم خواجگان کے حلقوں میں بیٹھے
یا مقلب القلوب یا محول الاحوال کے نعرے بلند کر رہے
تھے۔ باالآخر وہی نتیجہ نکلا جو ایک ایسے مقابلہ کا نکلنا
تھا جس میں ایک طرف گولہ بارود ہو اور دوسری
طرف ختم خواجگان!

مولانا کو اہل مذہب سے شکوہ یہ ہے کہ اُنہوں نے مذہب کی شکل اور رائش کے مظاہر کو تو قائم رکھا لیکن اُس کی روح کو برباد کر ڈالا۔ فرماتے ہیں کہ:

بد بختی یہ ہے کہ ہمارے اعمال کی صورتیں مسخ نہیں ہوئی
ہیں مگر حقیقت غارت ہو گئی ہے۔ قومی تنزل کے معنی
یہی ہیں کہ تمام قومی و دینی اشغال بظاہر قائم رہتے

ہیں لیکن اُن کی روح مفقود ہو جاتی ہے۔ یہ نہیں ہے کہ ہماری مسجدیں اُجڑ گئی ہوں، کتنے جھاڑ اور فانوس ہیں جن سے مسجدیں بقعہ نور بنائی جاتی ہیں! مگر رونا یہ ہے کہ دل اُجڑ گئے ہیں اور یہ وہ بستی ہے کہ جب ویران ہو جائے تو پھر آبادی کہاں۔

جشن تذکار ولادت نبویؐ کے سلسلہ میں البلاغ کے صفحات پر اسی قسم کے احساسات اپنے مخصوص انداز میں ظاہر فرماتے ہیں:۔

تم اپنے گھروں کو مجلسوں سے آباد کرتے ہو، مگر تمہیں اپنے دل کی اُجڑی ہوئی بستی کی بھی کچھ خبر ہے؟ تم کافوری شمعوں کی قندیلیں روشن کرتے ہو مگر اپنے دل کی اندھیاری کو دور کرنے کے لئے کوئی چراغ روشن نہیں کرتے۔ تم پھولوں کے گلدستے سجاتے ہو، مگر آہ تمہارے اعمال حسنہ کا پھول مرجھا گیا ہے، تم گلاب کے چھینٹوں سے اپنے رومال و آستین کو معطر کرنا چاہتے ہو مگر آہ تمہاری غفلت کہ تمہاری عظمت اسلامی کی عطر بیزی سے تمہاری رُوح یکسر محروم ہے۔ کاش تمہاری مجلسیں تاریک ہوتیں، تمہارے اینٹ اور چونے کے مکانوں کو زیب و زینت یک ذرہ نصیب ہوتی تمہاری آنکھیں رات رات بھر مجلس آرائیوں میں نہ جاگتیں، تمہاری زبانوں سے ماہ ربیع الاوّل کی ولادت

کے لئے دنیا کچھ نہ سنتی مگر تمہاری روح کی آبادی معمور
ہوتی تمہارے دل کی بستی نہ اجڑتی۔ تمہارا طالع بیدار ہوتا اور
تمہاری زبانوں سے نہیں مگر تمہارے اعمال کے اندر سے
اسوہ حسنہ نبوی کی مدح وثنا کے ترانے اٹھتے . . . . . .
تم کہ اس ماہ حریت کے ورود کی خوشیاں مناتے ہو اور
اس کے لئے ایسی تیاریاں کرتے ہو گویا وہ تمہارے ہی
لئے اور تمہاری ہی خوشیوں کے لئے آیا ہے۔ خدارا مجھے
بتلاؤ کہ تم کو اس پاک اور مقدس یادگار کے منانے کا
کیا حق ہے؟ کیا موت اور ہلاکی کو اس کا حق پہنچتا ہے
کہ زندگی اور روح کا اپنے کو ساتھی بنائے۔ کیا ایک مردہ
لاش پر دنیا کی عقلیں نہ ہنسیگی؟ اگر وہ زندوں کی طرح
زندگی کو یاد کرے گی؟ ہاں یہ صحیح ہے کہ آفتاب کی روشنی
کے اندر دنیا کے لئے بڑی ہی خوشی ہے۔ لیکن ایک
اندھے کو کب زیب دیتا ہے کہ وہ آفتاب کے نکلنے
پر آنکھوں والے کی طرح خوشیاں منائے؟"

نزاعی عقاید کے متعلق بھی مولانا منطقی ملائیت کے طور طریقوں سے بہت
بیزار ہیں۔ وہ اختلاف عقائد کی بحث کو بہت اونچی سطح سے دیکھتے ہیں۔ الہلال
میں ایک جداگانہ شیعہ کالج قائم کرنے کی تحریک پر اعتراض کرتے ہوئے
مولانا نے شیعہ سنی نزاع اور اختلاف عقائد پر صاف صاف اپنے دل

کی بات کہدی :-

"میں نہیں جانتا کہ سُنیت کیا چیز ہے اور شیعیت کسے کہتے ہیں ۔ میں اللہ پر ایمان رکھتا ہوں اور اُس کی کتاب میرے پاس ہے اور میں نے رسول کو پہنچانا ہے ۔ مجھے عقل دی گئی ہے اس لئے میں اشیاء کے حقائق ثابت تسلیم کرتا ہوں ۔ پس جو چیز سفید ہے سفید ہے اور جو سیاہ ہے سیاہ ہے ۔ کوئی سفید کپڑا اس لئے سیاہ نہیں ہو سکتا کہ اُس کو فلاں فرقے نے پہنا اور کوئی حق اس لئے باطل نہیں ہو سکتا کہ یہ فلاں انسان کی طرف منسوب ہے یہ ہیں میرے عقائد ۔ یہ ہے میرا مسلک اور یہ ہے وہ بصیرت راسخہ جو کتاب و سنت نے مجھے عطا کی اس بصیرت نے مجھکو ہمیشہ فریقانہ نزاعات سے الگ رکھا ۔

مولانا نے توہمات اور مذہب کی ظاہری رسم و راہ اور نزاعی عقائد کے ان تمام بتوں پر سخت ضربیں لگائی ہیں اور کہیں کہیں مزاحیہ اور طنزیہ رنگ میں مذہب اور مذہبی تقدس کے ان ٹھیکہ داروں کی نقاب کشائی کی ہے ۔ چڑیا چڑے کی کہانی میں مولانا نے ایک چڑے کا نام قلندر رکھ دیا اور ایک کا ملّا اور ایک کا صوفی ، پھر اس طرح ملایت اور رائج الوقت تصوف کے متعلق اپنے تاثرات کا ایک گوشہ ظاہر کیا ہے :-

قلندر اور موتی سے آپ کی تقریب ہو چکی ۔ اب مختصراً

ملّا اور صوفی کا حال بھی سن لیجئے - ایک چڑا بڑا ہی تنومند اور جھگڑالو ہے - جب دیکھو زبان فرفر چل رہی ہے - سر اٹھا ہوا اور سینہ تنا ہوا رہتا ہے - جو بھی سامنے آجائے دو دو ہاتھ کئے بغیر نہ رہیگا - کیا مجال کہ ہمسایہ کا کوئی چڑا اس محلہ کے اندر قدم رکھ سکے - کئی شہزوروں نے ہمت دکھائی لیکن پہلے ہی مقابلہ میں چت ہو گئے - جب کبھی فرش پر یاران شہر کی مجلس آراستہ ہوتی ہے تو یہ سروسینہ کو جنبش دیتا ہوا اور اپنے دائیں نظر ڈالتا ہوا آموجود ہوتا ہے اور آتے ہی اچک کر کسی بلند جگہ پر پہنچ جاتا ہے - اپنے شیوہ خاص میں اس تسلسل کے ساتھ چوں چاں شروع کر دیتا ہے کہ ٹھیک ٹھیک قاآنی کے واعظک کا نقشہ آنکھوں میں پھر جاتا ہے . . . . .
. . . . فرمائیے اگر اُس کا نام ملّا نہ رکھتا تو کیا رکھتا . . . .

ٹھیک اس کے برعکس ایک دوسرا چڑا ہے - تعرف الاشیأ باضدادہا - اُسے جب دیکھیئے اپنی حالت میں گُم اور خاموش ہے -

کاں را کہ خبر شد خبرش باز نہ آمد

بہت کیا تو کبھی کبھار ایک ہلکی سی ناتمام چوں کی آواز
نکال دی اور اس ناتمام چوں کا بھی انداز لفظ و سخن
کا سا نہیں بلکہ ایک ایسی آواز ہوتی ہے جیسے کوئی آدمی
سر جھکائے اپنی حالت میں گم پڑا رہتا ہو اور کبھی کبھی
سر اٹھا کر ہا، کر دیتا ہو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں نے
یہ حال دیکھا تو اس کا نام صوفی رکھ دیا ۔

اس قسم کے ارباب مذہب کے متعلق مولانا کی یہ معنی خیز تنقیح مزاج و تفنن کے انداز میں سنجیدہ تنقید سے بھی زیادہ معنی خیز ہے جس سے یہ حقیقت ظاہر ہوتی ہے کہ مولانا اپنے مذہبی مقام پر ان عام مذہبی اوضاع کو اس قدر قابل تحقیر سمجھتے ہیں کہ انہیں کسی سنجیدہ بحث کے قابل بھی نہیں سمجھتے ۔ حقیقت یہ ہے کہ مولانا نے اپنی تحریروں میں اس قسم کے مباحث پر زور نہیں دیا مگر "گنبد دستار" کی اس تمام "عمارت گری" کو کبھی بھی کسی احترام کے قابل نہیں سمجھا اور جب کبھی سر راہ ذکر آیا تو مزاج و تفنن کے انداز کلام کو ایسے موضوعات کے لئے کافی سمجھا ۔ مذہب کے متعلق اپنے تصورات کا رخ ان قدیم اضافتوں سے موڑ کر مولانا اہل مذہب کے لئے صدق و صفا کا ایک معیار مقرر کرتے ہیں، کچھ اس انداز سے کہ پڑھنے والے کو معلوم ہو جاتا ہے کہ خود مولانا کا مقام کیا ہے ۔ فرماتے ہیں کہ :-

اصحاب طریق و معارف کی باتوں کو سمجھنے کے لئے بھی
دل صافی اور فہم مستعد و عالی چاہیئے ۔ صرف مدرسوں کی

دماغ سوختگی اور تسبیح وسجادہ کی دوکانداری سے یہاں
کام نہیں چلتا . . . .
سب سے اعلیٰ اور اشل طبقہ اُن اخص الخواص نفوس مرکزی کا ہے
جن کو تائید توفیق الٰہی عزائم امور کے لئے چُن لیتا ہے . . .
. . جن کا نورِ عمل مشکوٰۃ نبوت سے ماخوذ اور جن کا قدم
طریق منہاج نبوت پر واقع ہوتا ہے . . . .
یہی لوگ ہیں جن کا وجود فی الحقیقت نظام حق و ہدایت کا
نظم ہے اور انبیائے کرام کی اصلی وراثت ان ہی میں منتقل
ہوتی ہے . . . . اور . . . . . سنت الٰہی
اپنی عادت جاریہ کے مطابق . . . کسی اصلح اور اشل بندے
کے قلب کا عزیمت و دعوت کے لئے انشراح کر دیتی
ہے . وہ اپنے عہد کے تمام اصحاب علم وحقیقت اور ارباب
صوامع و مدارس کو تنگنائے رخصت وضعف میں پیچھے چھوڑ
کر منزلوں آگے نکل جاتا ہے ۔

مولانا نے تذکرہ کے صفحات پر مذہبی قیادت کا ایک آئیڈیل
پیش کیا ہے اور یہ وہی نقشہ ہے جس میں وہ اپنے تصورات اور ارادوں
کو منقش کرتے ہیں ۔ فرماتے ہیں کہ " سنت الٰہی " جب کسی ایسے شخص کو کارگاہ
ہستی میں لاتی ہے تو

سب دیکھتے کے دیکھتے رہ جاتے ہیں اور وہ شخص بڑھ کر

عزیمت ودعوت وہدایت عام کا باب مسدود کھول دیتا ہے اور اُس کی زبان ہمت ومقال فتوہ اس ترانہ رجیز سے زمزمہ ساز عالم ہوتی ہے۔

تاب یک جلوہ نیاورد نہ موسیٰ ونہ طور
یک دلم ہست کزیں گونہ ہزاراں دیدست

اگرچہ اس عہد میں ہزاروں مدعیان کار موجود ہوں مگر اس فضیلت مخصوص میں اس کا کوئی سہیم وشریک نہیں ہوتا۔ صرف اُسی کو اُس عہد کی اقلیم ہدایت کی سلطانی وفرمانروائی پہنچتی ہے اور صرف وہی اپنے زمانہ کا کلید بردار خزائن برکات وفیضان سماویہ ہوتا ہے۔ تمام ارباب طریق ناچار ہوتے ہیں کہ اپنے اپنے چراغ اُسی مصباح ہدایت سے روشن کریں اور تمام رہروان جادہ مقصد مجبور ہوتے ہیں کہ اوسی کے کاروان فضل ادرقافلہ کرامت کی آوازدرا پر اپنے اپنے قدم اُٹھائیں۔

یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا!
ہر مدعی کیواسطے دار ورسن کہاں

. . . . بڑے بڑوں کا عذر یہ ہوتا ہے کہ وقت ساتھ نہیں دیتا اور سر و سامان و اسباب کار فراہم نہیں۔ لیکن وقت کا عازم و فاتح اُٹھتا ہے اور کہتا ہے کہ اگر وقت ساتھ نہیں تو میں اس کو ساتھ لوں گا۔ اگر سر و سامان نہیں تو اپنے ہاتھوں سے تیار کرلوں گا۔ اگر زمین موافق نہیں تو آسمان کو اُترنا چاہیئے۔ اگر آدمی نہیں ملتے تو فرشتوں کو ساتھ دینا چاہیئے۔ اگر انسانوں کی زبانیں گونگی ہوگئی ہیں تو پتھروں کو چیخنا چاہیئے . . . . وہ وقت کا خالق اور عہد کا پالنے والا ہوتا ہے اور زمانہ کے حکموں پر نہیں چلتا بلکہ زمانہ مجبور ہوتا ہے کہ اُس کی جنبش لب کا انتظار کرے . . . .

مذہبی قیادت کے اس آئیڈیل کو مولانا نے آج سے تیس سال پہلے پیش کیا تھا اور وہ بار بار اُس کو دُہراتے رہے۔ لیکن علماء کی جماعت کو جن میں اکثریت دوکانداروں کی تھی مولانا کی پیشقدمی ذرا بھی نہ بھائی بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اس میدان میں بھی مولانا اکثر تنہا رہے۔ پھر جب ملک کے سیاسی ہنگاموں میں مولانا کے ہم قوموں کی ایک بڑی اکثریت اُن کے سیاسی عقائد کی مخالف ہوگئی تو سیاسی تعصبات کو اُنکی مذہبی حیثیت اور اُن کے علم و فضل کے خلاف ایک شدید حربہ بنالیا گیا۔ ان ہنگاموں میں وہ پہلے سے زیادہ تنہا ہوگئے یہی تنہائی اور بھی زیادہ مولانا کی انفرادیت کو قوی کرتی رہی اور شاید اسی نئے

اُن کی بیزاری میں بھی اضافہ ہوتا رہا۔

باوجود اپنے مذہبی وقار کے مولانا کی شخصیت کا ایک اور پہلو بھی بہت دلچسپ ہے اور وہ یہ کہ ہم دیکھتے ہیں کہ مولانا کا علم و فضل اُن کی ہنگامی لغزشوں اور انسانی کمزوریوں کے تذکرہ سے شرماتا نہیں۔ بلکہ زندگی کے ایسے حوادث کو وہ "عقلیت" اور اعتدال نظر کی کسوٹی پر پرکھتے ہیں اور مذہبیت اور تقدس کے ایک بے لوچ کٹہرے میں بند نہیں کر دیتے۔ گزشتہ صفحات میں ایک موقعہ پر مولانا کے یہ الفاظ نقل کئے گئے ہیں کہ

"طبیعت اس پر مطمئن نہ ہو سکی کہ زندگی کو غلطیوں سے یکسر معصوم بنا دیا جائے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس روزگار خراب میں زندگی کو زندگی بنائے رکھنے کیلئے کچھ نہ کچھ غلطیاں بھی ضرور کرنی چاہئیں۔"

اسی فلسفہ سے اُنہوں نے اپنی زندگی کے اذکار میں استدلال فرمایا ہے چنانچہ اپنے ایک عشق مجازی کے ابتلا کا ذکر بھی کرتے ہیں اور اپنی ایسی دوسری مشغولیتوں کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں۔ غبار خاطر کے آخری مکتوب میں ایک ایسے واقعہ کا ذکر کیے ہیں جب وہ زہد و تقویٰ کی مقررہ راہوں سے ہٹ گئے تھے۔ وہ ان لغزشوں کو اقتضائے انسانیت سمجھتے ہیں اور پنی مجتہدانہ قوت کے بھروسے پر خود اپنے احوال میں لیسے ممنوعات کا ذکر کرتے ہیں جن کا تذکرہ زہد و تقویٰ کی خشک محفلوں میں ناپسندیدہ سمجھا جاتا ہے۔ یکن جب وہ کسی قدر تفصیل کے ساتھ اپنے مذاق موسیقی کا ذکر فرماتے ہیں

توسب سے پہلے ہمارے اس گمان کی تصدیق ہوتی ہے کہ مولانا کے مذہبی تقدس میں ایک سریع الحس آرٹسٹ کے آرٹ کی لطیف روح بھی کارفرما ہے جو اُن کے لئے اُن کی ذہنی تنہائی اور کم آمیزی کا نعم البدل ہوتی ہوگی۔

اپنے مذاق موسیقی کا قصہ اس طرح بیان فرماتے ہیں کہ اُن کے والد ماجد کے حلقۂ عقیدت میں ایک موسیقی کا استاد مستیا خان بھی حاضر ہا کرتا تھا۔ اُس سے مولانا نے فن موسیقی حاصل کیا۔ یعنی اس عالم میں کہ ادھر تو گھر میں والد کی مسند رشد و ہدایت کے روبرو ہدایہ اور مشکوٰۃ کے پڑھنے والے جمع رہتے تھے اور ادھر مولانا کی نوجوانی کی خلوتوں میں سا، رے، گا، ما کے سبق جاری تھے۔ داستان کے اس دلچسپ ٹکڑے کو خود مولانا کے دلپذیر انداز بیاں میں سُن لیجیے:-

"میری عمر ۱۷ برس سے زائد نہ ہوگی، لیکن اُس وقت بھی طبیعت کی اُفتاد یہی تھی کہ جس میدان میں قدم اُٹھایئے پوری طرح اُٹھایئے اور جہاں تک راہ ملے بڑھتے چلے جایئے۔ کوئی کام بھی ہو لیکن طبیعت اس پر کبھی راضی نہ ہوئی کہ اُسے ادھورا کر کے چھوڑ دیا جائے۔ جس کوچہ میں بھی قدم اُٹھایا اُسے پوری طرح چھان کر چھوڑا۔ ثواب کے کام کئے تو وہ بھی پوری طرح کئے، گناہ کے کام کئے تو اُنھیں بھی ادھورا نہ چھوڑا۔ رندی کا کوچہ ملا تھا تو اُس میں سب سے آگے رہے تھے۔ پارسائی

کی راہ ملی تو اُس میں بھی کسی سے پیچھے نہ رہے۔ طبیعت کا تقاضا ہمیشہ یہی رہا کہ جہاں کہیں جائیے ناقصوں اور خام کاروں کی طرح نہ جائیے۔ رسم وراہ رکھیئے تو کانٹوں سے رکھیئے۔ . . . چنانچہ زندگی کے چمنستان ہزار رنگ کا ایک پھول یہ بھی تھا کہ کچھ دیر کے لئے رُک کر بُو باس لے لی اور آگے نکل گئے . . . . البتہ موسیقی کا ذوق اور تاثر جو دل کے ایک گوشہ میں رچ گیا تھا دل سے نکالا نہیں جا سکتا تھا اور آج تک نہیں نکلا۔ . . . . میں آپ سے ایک بات کہوں میں نے بارہا اپنی طبیعت کو ٹٹولا ہے، میں زندگی کی احتیاجوں میں ہر چیز کے بغیر زندہ رہ سکتا ہوں، لیکن موسیقی کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ آوازِ خوش میرے لئے زندگی کا سہارا، دماغی کاوشوں کا مداوا اور جسم و دل کی ساری بیماریوں کا علاج ہے . . . .

معلوم نہیں کہ جبہ و دستار کی اقلیم میں مولانا کا یہ مکتوب کتنے زلزلے پیدا کر چکا ہوگا لیکن مولانا کی وسعت نظر کا جو ثبوت اس انکشاف حقیقت کے اندر مضمر ہے وہ اُن کے کردار کا ایک بہت ہی دلنواز پہلو ہے۔ یہ انکشاف ہم پر سب سے بڑی تو یہ بات آشکار کرتا ہے کہ اہل مذہب کی رسم وراہ کے تصنعات سے مولانا کسقدر "بغاوت" کرتے رہے ہیں۔ باوجودیکہ مولانا کی شخصیت کے وقار میں بڑا حصہ مذہب

ہی کا ہے۔لیکن وہ اپنے مذہب کے تصور کو اپنے آزاد افکار کی انفرادیت سے اسقدر وابستہ رکھتے ہیں کہ اپنے اجتہادات پر مدرسہ اور حجرہ کے اقتدار کو تسلیم نہیں کرتے غبار خاطر اس آخری مکتوب میں موسیقی سے اپنی طبیعت کی وابستگی کا ذکر کرتے ہوئے وہ عہد ماضی کے متعدد مشاہیر، اہل علم اور ارباب مذہب کی خوش مذاقی کو سند لاتے ہیں۔ مثلاً عہد عباسیہ کے اسحاق موصلی، ابراہیم بن مہدی مصر کے شیخ سلامہ پھر امیر خسرو اکبر و جہانگیر کے عہد کے ملا مبارک ملا عبدالقادر بدایونی، علامہ سعد اللہ، شیخ معالی خان، قاضی القضاۃ شیخ عبدالوہاب گجراتی، دانشمند خان، سرآمد علمائے مصر شیخ علاءالدین صوفی شیخ جمالی صاحب سیر الاولیا، مرزا مظہر جان جاناں، پھر علمائے فرنگی محل میں حضرت بحرالعلوم، اودھ کی نوابی میں علامہ تفضل حسین، اس کے بعد وہ شریعت اسلامی کے نقطہ نظر کا ایک باریک نکتہ بیان فرماتے ہیں اور صحیح مذاق موسیقی کو حالات کا تابع قرار دیتے ہیں۔ فرماتے ہیں کہ :۔

> یہ ظاہر ہے کہ قوموں کے عروج و ترقی کے زمانہ میں جو اشتغال تحسین فکر اور تہذیب طبع کا باعث ہوتا ہے، وہی تنزل میں فکر کے لئے فتنہ اور طبیعت کے لئے مہلکہ بن جاتا ہے۔ ایک ہی چیز حسن استعمال اور اعتدال سے فضل و کمال کا زیور ہوتی ہے اور سوء استعمال اور افراط و تفریط عمل سے بداخلاقی اور بدعیبی کا دھبہ بن جاتی ہے۔ موسیقی کا ایک

شوق تو اکبر کو تھا کہ اپنی یلغاروں کے بعد جب کمر کھولتا تو مجلس سماع و نشاط سے اُن کی تھکن مٹاتا اور پھر ایک شوق محمد شاہ رنگیلے کو تھا کہ جب تک محل کی عورتیں دھکیل دھکیل کر اُسے پردہ سے باہر نہ کر دیتیں دیوان خانہ میں قدم نہ رکھتا۔

یہ تو موسیقی کے متعلق ایک خارجی اور واقعیت پسند نقطہ نظر ہے لیکن خالص شرعی اور مذہبی معیار بھی جو مولانا قائم کرتے ہیں عام رسم وراہ تقدس و تصنع سے جدا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ :۔

اس بات کی عام طور پر شہرت ہو گئی ہے کہ اسلام کا دینی مزاج فنون لطیفہ کے خلاف ہے اور موسیقی محرمات شرعیہ میں داخل ہے حالانکہ اس کی اصلیت اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ فقہا نے سد وسائل کے خیال سے اس بارے میں تشدد کیا اور یہ تشدد بھی باب قضا سے تھا نہ کہ باب تشریع سے۔ قضا کا میدان نہایت وسیع ہے ہر چیز جو سوءِ استعمال سے کسی مفسدہ کا وسیلہ بن جائے قضاً رد کی جا سکتی ہے لیکن اُس سے تشریع کا حکم اصلی اپنی جگہ سے نہیں ہل سکتا۔

اس اجمال میں شریعت کے حکم اور اصول تشریع و قضا کی جو توضیح مولانا نے کی ہے وہ اُن کے علم و فضل کے راستے کی صحیح نشاندہی

کرتی ہے۔ مگر اس راستہ سے رائج الوقت مذہبی قیادت و امامت کا راستہ کہیں بھی نہیں مل سکتا۔ اگر آج سے ۵۰ سال پہلے غبار خاطر کا یہ مکتوب شائع ہوا ہوتا تو ہم مدرسوں کے حجروں میں اور مسجدوں کے منبروں پر ایک ہنگامہ دار و گیر برپا دیکھتے! لیکن نئی زندگی اور نئی دنیا کی یہ ایک نشانی ہے کہ مولانا نے باب قضا اور باب تشریع کے امتیاز کو موسیقی اور لہو و لعب کی بحث میں اس طرح واضح کردیا لیکن دیوبند سے بریلی، لکھنؤ اور بنگال تک کوئی ایک پتّا ایسا نہ تھا جو ہلتا اور نہ کوئی ایسا حلقوم تھا جس کی رگوں میں تناد پیدا ہوتا!

مولانا کے اندر شاعر اور آرٹسٹ کی فطرت نے جس طرح اپنی انفرادی حیثیت کو موسیقی کی بحث میں بے نقاب کیا ہے وہ کسی دوسرے مبحث میں نہ کرسکتی اسی مکتوب میں مولانا نے اپنے شاعرانہ وجدان کو اپنے ادب کے سانچے میں اس طرح ڈھال دیا ہے کہ تاج کی چھت پر رات کی ٹھنڈی چاندنی کے کھیت میں شاعر اور مغنی کے نفس گرم نے "مذہبی علم و فضل کی سنجیدہ روح کو اپنے اندر تحلیل کرلیا" اپنی اس شاعرانہ وارفتگی کا عالم اس طرح بیان فرماتے ہیں:۔

رات کو ستار لیکر تاج چلا جاتا اور اُس کی چھت پر جمنا کے رُخ بیٹھ جاتا۔ پھر جوں ہی چاندنی پھیلنے لگتی ستار پر کوئی گت چھیڑ دیتا اور اُس میں محو ہو جاتا۔ کیا کہوں اور کس طرح کہوں کہ فریب تخیل کے کیسے کیسے جلوے اِن ہی آنکھوں کے آگے گذر چکے ہیں۔ ۔ ۔ ۔ ۔

. . . . رات کا سناٹا، ستاروں کی چھاؤں، ڈھلتی چاندنی اور اپریل کی بھیگی رات۔ چاروں طرف تاج کے منارے سر اٹھائے کھڑے تھے، بُرجیاں دم بخود بیٹھی تھیں، بیچ میں چاندنی سے دھلا ہوا مرمریں گنبد اپنی کرسی پر بے حس و حرکت متمکن تھا، نیچے جمنا کی روپہلی جدولیں بل کھا کھا کر دوڑ رہی تھیں اور اوپر ستاروں کی اَن گنت نگاہیں حیرت کے عالم میں تک رہی تھیں۔ نور و ظلمت کی اس ملی جلی فضا میں اچانک پردہ ہائے نستار سے نالہائے بے حرف اُٹھتے اور ہوا کی لہروں پر بے زور تیرنے لگتے، آسمان سے تارے جھڑ رہے تھے اور میری انگلی کے زخموں سے نغمے! . . . .

کچھ دیر تک فضا تھمی رہتی گویا کان لگا کر خاموشی سے سُن رہی ہے۔ پھر آہستہ آہستہ تماشائی حرکت میں آنے لگتے۔ چاند بڑھنے لگتا یہاں تک کہ سر پر آ کھڑا ہوتا، ستارے دیدے پھاڑ پھاڑ کر تکنے لگتے۔ درختوں کی ٹہنیاں کیف میں آ کر جھومنے لگتیں، رات کے سیاہ پردوں کے اندر سے عناصر کی سرگوشیاں صاف سنائی دیتیں۔ بارہا تاج کی بُرجیاں اپنی جگہ سے ہل گئیں اور کتنی ہی مرتبہ ایسا ہوا کہ منارے اپنے کاندھوں کی جنبش کو نہ روک سکے۔

آپ باور کریں یا نہ کریں مگر واقعہ ہے کہ اس عالم میں بارہا میں نے بُرجیوں سے باتیں کی ہیں اور جب تاج کے گنبد خاموش کی طرف نظر اُٹھائی ہے تو اُس کے لبوں کو ہلتا پایا ہے۔

تو مپندار کہ ایں قصہ زخود می گویم!

گوش نزدیک لبم آر کہ آوازے ہست

ایک شاعر کی زبان سے مولانا یہ دعوے کر سکتے ہیں کہ:۔

کہ من در زیر دلق خود قبائے کوہکن دارم

مولانا کے سوانح نگار کا تصوّر تو یہ ہونا چاہیئے کہ اگر مولانا نے علم و سیاست کے اُن مقامات کو طے نہ کیا ہوتا جہاں علم و فضل اور افکار سیاسی کا قدرتی وقار اُن کا دامن پکڑے ہوئے ہے تو ہم اُن کے ادب کو شعرا اور آرٹ کے ایسے عالم میں پاتے جہاں دنیا کے شعراء اور آرٹسٹ کی روحیں اُن کا دامن پکڑے ہوتیں ———— لیکن اِس وقت تو مولانا کا مقام گاندھی اور ٹیگور کے درمیان کہیں ہے۔ اگر اُن کی کم آمیز انفرادیت اس قدر کم آمیز نہ ہوتی تو اُن کے صحیح مقام کا تعین بھی اس قدر مشکل نہ ہوتا۔

۱۲

مولانا کے اسلوب نگارش میں مزاح و تفنن اور طنز کا جو پہلو کہیں کہیں نمایاں ہوتا ہے۔ وہ قطعاً "آورد" نہیں ہے بلکہ اُن کی خوش طبعی کی ایک قدرتی "آمد ہے" جو بے اختیار ظاہر ہوتی ہے۔ وہ عام طور پر اپنے قلم کو اپنی طبیعت کے اس عنصر سے کھیلنے نہیں دیتے، لیکن خوش طبعی اور ظرافت جب زندگی کے ہجوم میں اُس کے مضحک پہلوؤں کے قریب آتی ہے تو علم و فضل کی تمامتر سنجیدگی بھی اُس کا راستہ نہیں روک سکتی۔ ادیب کے ادب کی قوس و قزح میں یہ رنگ کتنا ہی مدھم ہو لیکن جب دوسرے رنگوں کے ساتھ ساتھ اپنی جگہ نمایاں ہوتا ہے تو نظروں کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ مولانا کے ادب کی قوس و قزح میں اُن کا یہ رنگ ایک ایسا رنگ ہے جس کا عکس اُن کی معنوی زندگی کے ایک دلنواز اور دلچسپ پہلو کو روشن کرتا ہے۔ یوں تو جس کسی نے صرف الہلال اور البلاغ اور تذکرہ ہی کے صفحات پر مولانا کے زورِ قلم کو دیکھا ہوگا وہ تو سوچ ہی نہیں سکتا کہ تفسیر قرآن اور مذہب و اخلاق کے نکات پر فکر و نظر کے دریا بہانے

والا قلم خوش طبعی کے یہ گُل بوٹے بھی بنا سکتا ہے ۔ لیکن اپنے عزیز دوست حکیم اجمل خاں کی طرح مولانا کی فطرت کا یہ پہلو بھی اُن کے معنوی بناوٹ میں زندگی کا نمک ہے ۔ حکیم صاحب مرحوم کی سنجیدگی اور خودداری کے بھاری پردوں کے پیچھے ایک لازوال مسکراہٹ مستور تھی جس سے کبھی کبھی اُن کا چہرہ چمک اُٹھا کرتا تھا ۔ حالانکہ معمولاً وہ تاتاری اور تیموری چہرہ ہر اجنبی کو اپنی سنجیدگی اور متانت سے بیک نظر مرعوب کر دیتا تھا ۔ تقریباً اسیطرح علم وفضل اور سیاسی قیادت کا جو چہرہ مولانا کی فطرت کے حقیقی چہرہ پر لگا ہوا ہے اس کو اگر ایک لمحہ کے لئے بھی ہٹایا جا سکے تو معلوم ہوگا کہ

ماورائے سخن بھی ہے ایک بات !

مولانا کی خصوصیت یہ ہے کہ اُن کی ذہانت بہت تیزی سے ہر شخص یا چیز کا مضحک پہلو دیکھ لیتی ہے ۔ اُن کی مزاحیہ نگارش کے زیادہ نمونے غبارِ خاطر ہی میں ملتے ہیں جن میں سے چند مثالاً پیش کئے جاتے ہیں ۔

اپنی قید کے ساتھی ڈاکٹر سیّد محمود کے مشاغل میں مولانا مزاح اور تفنن کا ایک پہلو دیکھتے ہیں اور اپنے ایک مکتوب میں بیساختہ اُسے اُجاگر کر دیتے ہیں ۔ قلعہ احمد نگر میں ڈاکٹر صاحب ہر صبح کو پرندوں کو بلا کر روٹی کھلانا پسند کرتے تھے یا تو یہ کسی قسم کا مذہبی توہم تھا یا طبیعت کا گداز تھا جو اُس قید کی تنہائی میں اُنہیں معصوم پرندوں کی زندگی کے چند لمحوں سے وابستہ کرتا تھا ۔ مولانا نے اس مشغلہ کے مزاحی پہلو پر انگلی رکھدی ۔

روزانہ صبح روٹی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے ہاتھ میں لیکر نکل جاتے ہیں اور صحن میں جا کھڑے ہوتے ہیں۔ پھر جہاں تک حلق کام دیتا ہے آآ کرتے جاتے اور ٹکڑے فضا کو دکھا دکھا کر پھینکتے رہتے۔ یہ صلائے عام میناؤں کو تو ملتفت نہ کرسکی البتہ شہرستان ہوا کے دریوزہ گران ہرجائی یعنی کووں نے ہر طرف سے ہجوم شروع کر دیا۔ میں نے کووں کو شہرستان ہوا کا دریوزہ گر اس لئے کہا کہ کبھی انہیں مہمانوں کی طرح جاتے دیکھا نہیں۔ طفیلیوں کے غول میں بھی بہت کم دکھائی پڑے۔ ہمیشہ اسی عالم پایا کہ فقیروں کی طرح ہر دروازے پر پہنچے صدائیں لگائیں اور چلدیئے . . . . . . بہرحال محمود صاحب آآ کے تسلسل سے تھک کر جوں ہی مڑتے یہ دریوزہ گران کوتہ آستین فوراً بڑھتے اور دسترخوان صاف کر کے رکھدیتے . . . .

محمود صاحب کی صلائے عام سے پہلے ہی یہاں کووں کی کائیں کائیں کی روشن چوکی بجتی رہتی تھی اب جو دسترخوان کرم بچھا تو نقاروں پر بھی چوب پڑ گئی۔ ایک دو دن تک تو لوگوں نے صبر کیا۔ آخر اُن سے کہنا پڑا کہ اگر آپ کے دست کرم کی بخشش مرگ

نہیں سکتیں تو کم از کم چند دنوں کے لئے ملتوی ہی کر دیجیئے ورنہ
ان ترکان یغما دوست کی ترک تازیاں کمروں کے اندر کے
گوشہ نشینوں کو بھی امن چین سے بیٹھنے نہ دیں گی۔ اور ابھی تو
صرف احمد نگر ہی کے کوؤں کو خبر ملی ہے اگر فیض عام کا یہ لنگر خانہ
اسی طرح جاری رہا تو عجب نہیں کہ تمام دکن کے کوّے قلعہ احمد نگر
پر حملہ بول دیں!

مولانا نے اپنے مکتوبات میں چاء کے متعلق اپنے ذوق کا بار بار ذکر کیا ہے اور کہیں کہیں تو اُنھوں نے اپنے شاعرانہ انداز میں بد مذاقوں کو طعن وطنز کی نوک سے بھی کرُیدا ہے۔ اس طنز کی نوک کتنی ہی باریک ہو کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ زہریلی ہے یا تعصب وعناد سے آلودہ ہے۔ مولانا کا ادب اس آلودگی سے بالکل پاک ہے۔ شاید اس لئے بھی کہ مولانا نے اپنی انانیت اور انفرادیت کا جو مقام معین کیا ہے وہ باقی نہ رہتا اگر وہ طعن وطنز کی عام سطح کے قریب آجاتے۔ اپنے اس مقام کی حفاظت کا خیال کبھی بھی مولانا کے دل سے دُور نہیں ہوتا اور یہی وہ چیز ہے جس نے مولانا کو جتنا بلند کیا اتنا ہی "مشکل" بنا دیا۔

مولانا چینی چاء جو نہایت ہلکی اور بغیر دودھ کے پی جاتی ہے زیادہ پسند کرتے ہیں اور اُس کے مقابلہ میں ہندستان کی چا، نوشی کے نسخوں کی مذمت کرتے ہیں۔ ایک مکتوب میں چاء کی تاریخ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:۔

سترہویں صدی میں جب انگریز اس سے آشنا ہوئے

تو نہیں معلوم اُن لوگوں کو کیا سوجھی کہ اُنہوں نے دودھ ملانے کی بدعت ایجاد کی اور چونکہ ہندستان میں چاء کا رواج ان ہی کے ذریعہ سے ہوا اس لئے یہ بدعت سیئہ یہاں بھی پھیل گئی۔ رفتہ رفتہ معاملہ یہاں تک پہنچ گیا کہ لوگ چاء میں دودھ ڈالنے کے بجائے دودھ میں چاء ڈالنے لگے! بنا ظلم در جہاں اندک بود ہر کہ آمد برآں مزید کرد! اب انگریز تو یہ کہکر الگ ہو گئے کہ زیادہ دودھ نہیں ڈالنا چاہئے لیکن تخم فساد نے جو برگ و بار پھیلا دئے اُنہیں کون چھانٹ سکتا ہے۔ لوگ چاء کی جگہ اب ایک طرح کا سیّال حلوہ بناتے ہیں کھانے کی جگہ پیتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں کہ ہم نے چاء پی! . . . .

ان حضرات میں ایک صاحب ایسے تھے جنہوں نے ایک دفعہ میرے ساتھ سفر کرتے ہوئے یہ چاء پی تھی اور محسوس کیا تھا کہ اگرچہ یہ بغیر دودھ کی ہے مگر اچھی ہے! یعنی بہتر چیز تو وہی دودھ والا گرم شربت ہوا جو وہ روز پیا کرتے ہیں مگر یہ بھی چنداں بُری نہیں۔ زمانہ کی عالمگیر خیرہ مذاقی دیکھتے ہوئے یہ اُن کی "صرف اچھی ہے" کی داد بھی مجھے غنیمت معلوم ہوئی کہ کبھی کبھی انہیں بلا لیا کرتا تھا کہ آئیے ایک پیالی اس "اچھی ہے" کی

بھی پی لیجیئے!

عمرت دراز باد کہ ایں ہم غنیمت است!

مولانا کی چاء نوشی کے دستورالعمل میں چاء کے ساتھ مٹھاس کا بھی خاص اہتمام ضروری ہے۔ وہ چینی چاء کے لئے خالص مصری کی آمیزش ضروری قرار دیتے ہیں۔ ایک دفعہ جب قیدخانہ میں مصری کو کوٹ کر باریک کرنے کے لئے ہاون دستہ کی ضرورت ہوئی تو بمشکل ایک پرانا اور بدصورت ہاون دستہ مہیا کیا جا سکا اُس پر تبصرہ فرماتے ہیں:۔

آجکل ٹاٹا نے ایک کتاب شائع کی ہے جو یہ خبر دیتی ہے کہ ہزاروں برس پہلے وسط ہند کے ایک قبیلہ نے ملک کو لوہے اور لوہاری کی صنعت سے آشنا کیا تھا۔ عجب نہیں کہ یہ ہاون بھی اسی قبیلہ کی دستکاریوں کا بقیہ ہو، اور اس انتظار میں گردش لیل و نہار کے دن گنتا رہا ہو کب قلعہ احمدنگر کے زندانیوں کا قافلہ یہاں پہنچتا ہے اور کب ایسا ہوتا ہے کہ سر پھوڑنے کے لئے تیشہ کے بجائے ہاون دستہ کی ضرورت پیش آئے۔۔

۔۔۔۔۔۔۔۔ خیر کچھ ہو مصری کوٹنے کی راہ نکل آئی۔ لیکن اب کٹی ہوئی مصری موجود ہے تو وہ چیز موجود نہیں جس میں مصری ڈالی جائے۔

لرد ستے کنم پیدا نمی یابم گریباں را

بعض اوقات نہایت سنجیدہ باتیں بھی مولانا اس طرح بیان کرتے ہیں کہ کوئی یہ نہ سمجھے کہ وہ اس بات کو سنجیدہ سمجھتے ہیں۔ اپنی گرفتاریوں اور قیدیوں کی طویل مدت کا ذکر کس انداز سے فرماتے ہیں:

پچھلی پانچ گرفتاریوں کی اگر مجموعی مدت شمار کی جائے تو سات برس آٹھ مہینے سے زیادہ نہ ہوگی۔ عمر کے ۵۳ برس جو گذر چکے ہیں اُن سے یہ مدت وضع کرتا ہوں تو ساتویں حصے کے قریب ہوتی ہے، گویا زندگی کے ہر سات دن میں ایک دن قید خانہ کے اندر گذرا، تورات کے احکام عشرہ میں ایک حکم سبت کے لئے بھی تھا۔ یعنی ہفتہ کا ساتواں دن تعطیل کا مقدس دن سمجھا جائے۔ مسیحت اور اسلام نے بھی یہ تعطیل قائم رکھی سو ہمارے حصہ میں بھی سبت کا دن آیا۔

اس کے بعد قید کے دو برس ۱۱ مہینے اور گذر گئے اور مجموعی مدت ۷ برس اور ۸ مہینے کی جگہ دس برس، ۷ ماہ ہوگئی۔ اس اضافہ کے خلاف کوئی شکوہ

کرنا نہیں چاہتا۔ البتہ اس کا افسوس ضرور ہے کہ وہ
ساتویں حصہ کی مناسبت کی بات مختل ہوگئی اور سبت
کی تعطیل کا معاملہ ہاتھ سے نکل گیا۔

اپنی زندگی کے ایک اہم واقعہ کو مولانا نے مزاح وتفنن کا موضوع بنالیا اور اگر کوئی یہ کہے کہ اس مزاح وتفنن کے باوجود اس واقعہ کی اہمیت باقی رہتی ہے کہ مولانا نے اپنی عمر کے ہر ہفتہ میں ایک دن قید خانہ میں کاٹا تو میرا گمان ہے کہ مولانا اس واقعہ پر زیادہ سنجیدہ تبصرہ ناپسند کریں گے انفرادیت کے قدرتی ذہن کا یہ تاثر کتنا ہی عجیب ہو لیکن غیر فطری نہیں ہے۔

سفر کی حالت میں چاء کے متعلق اپنے معلومات کا ذکر فرماتے ہیں:۔

صبح کی چاء کے لئے سفر میں یہ معمول رہتا ہے کہ رات کو
عبداللہ اسپرٹ کا چولہا اور پانی کی کیتلی پانی کی مقدار
مطلوب سے بھری ہوئی ٹیبل پر رکھ دیتا ہے چاء دانی
اُس کے پہلو میں جگہ پاتی ہے کہ بحکم وضع شئی فی محلہ یہی اُس
کا محل صحیح ہونا چاہیئے۔ مگر شکر دان اور فنجان کے لئے
اُس کا قرب ضروری نہ ہوا کہ وضع الشئی فی غیر محلہ میں داخل ہوجاتا۔
اگر صبح تین سے چار بجے کے اندر کوئی اسٹیشن آجاتا ہے تو
اکثر حالتوں میں عبداللہ آکر چاء دم دے دیتا ہے، نہیں آیا
تو پھر مجبے ہی اپنے دست شوق کی کامجویانہ سرگرمیاں

کام میں لانی پڑتی ہیں۔ اکثر حالتوں کی قید اس لئے لگانی پڑی کہ تمام کلیوں کی طرح یہ کلیہ بھی مستثنیات سے خالی نہیں ہے۔ بعض حالتوں میں گاڑی اسٹیشن پر رُک بھی جاتی ہے مگر عبداللہ کی صورت نظر نہیں آتی۔ پھر جب نظر آتی ہے تو اُس کی معذرتیں میری فکر کاوش آشنا کے لئے ایک دوسرا ہی مسئلہ پیدا کر دیتی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ نسیم صبحگاہی کا ایک ہی عمل دو مختلف طبیعتوں کے لئے دو متضاد نتیجوں کا باعث ہوتا ہے۔ اُس کی آمد مجھے بیدار کر دیتی ہے عبداللہ کو اور زیادہ سُلا دیتی ہے! الارم کی ٹائم پیس بھی اُس کے سرہانے رہنے لگی پھر بھی نتائج کا اوسط تقریباً یکساں ہی رہا۔

چاء، اور سگریٹ کے امتزاج کو ایک خاص شاعرانہ انداز میں بیان فرماتے ہیں:

شاید آپ کو معلوم نہیں کہ چاء کے باب میں میرے بعض اختیارات ہیں۔ چاء کی لطافت و شیرینی کو تندی و تلخی سے ترتیب دیکر میں نے ایک کیف مرکب پیدا کرنے کی کوشش کی ہے (میں چاء کے پہلے گھونٹ کے ساتھ ہی متصلاً ایک سگریٹ بھی سلگا لیا کرتا ہوں) پھر اُس ترکیب خاص کا نقشِ عمل یوں جماتا ہوں کہ تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد چاء کا ایک گھونٹ لوں گا اور متصلاً سگریٹ کا بھی ایک کش لیتا رہوں گا۔

اس طرح اس سلسلۂ عمل کی ہر کڑی چاء کے ایک گھونٹ اور
سگریٹ کے ایک کش کے باہمی امتزاج سے بتدریج ڈھلتی
جاتی ہے۔ مقدار کے حسن تناسب کا انضباط ملاحظہ ہو کہ ادھر
فنجان آخری جرعہ سے خالی ہوا اور ادھر تماکوے آتش زدہ
نے سگریٹ کے آخری خط کشیدتک پہنچ کر دم لیا۔ کیا
کہوں ان دو اجزائے تند و لطیف کی آمیزش سے کیف و سرور
کا کتنا معتدل مزاج ترکیب پذیر ہوگیا ہے۔

کیف و سرور کے اس معتدل مزاج کی یہ نکتہ رسی مولانا کے شاعرانہ ادب کی ایک خصوصیت ہے۔ **مولانا** کے اس قسم کے ہلکے لٹریچر میں

ہر چند ہو مشاہدہ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے ساغر و مینا کہے بغیر

وہ مسکراتے ہیں مگر قہقہہ نہیں لگاتے، شاید وہ جانتے ہیں کہ اُن کا مزاج قہقہے کے ساتھ بے لطف ہو جائے گا۔ اُس کے لئے صرف مسکراہٹ ہی موزوں ہے یا یہ کہ ضبط کی عادت اب اس قدر مستحکم ہوگئی ہے کہ جذبات کا یہ غیر معتدل مظاہرہ اُنہیں اپنی انفرادیت کی توہین معلوم ہوتا ہے۔ بہرحال جس طرح اپنی زندگی کے دوسرے مشاغل میں اسی طرح ادب میں **مولانا** نے ایک مخصوص توازن قائم رکھا ہے جس کی خوبی تو یہ ہے کہ مولانا کی خوددار انفرادیت اپنا وقار قائم رکھتی ہے لیکن خرابی یہ ہے کہ جہاں ہم چاہتے ہیں کہ مولانا صاف صاف اور کھل کر فرمائیں وہاں بھی وہ قلم و زباں کی خودداری کو ایک لمحہ کے لئے بھی

ترک نہیں کر سکتے۔ بہت سے مواقع ایسے گذر جاتے ہیں جب ہم احساس کے اس نقطہ تک پہنچ جاتے ہیں کہ بس اب مولانا کا ہاتھ حقیقت کے تمام پردے اُٹھا دیگا لیکن وہ نہیں اُٹھتے۔ جو لوگ مولانا کے قریب جا کر کچھ دیکھنا اور سمجھنا چاہتے ہیں وہ بھی مولانا کے ضبط و اعتدال کو راستہ روکے ہوئے پاتے ہیں اور خود مولانا اُن کے لئے ایک شجرِ ممنوعہ اور مولانا کے کمالات ثمرِ ممنوعہ بن جاتے ہیں! عجائبات سحر و ساحری کے قصوں میں وہ جو قلعہ کا بُرج بنایا جاتا ہے وہ دُور سے تو نظر آتا ہے لیکن قریب جائیے تو غائب ہو جاتا ہے۔ کچھ وہی معاملہ مولانا کے اور عوام کے درمیان پیش آتا ہے اور عوام کی نارسائی کا افسانہ مولانا کی سوانح حیات کا ایک جزو بن جاتا ہے۔

۱۳

مولانا کی تحریروں میں مزاح و تفنن کا رنگ جب گہرا و تیز ہوتا ہے تو ایک دھاردار طنز کی صورت اختیار کرتا ہے۔ مگر ایسے مواقع بہت کم پیش آتے ہیں اور یہ تلوار اپنی نیام سے بہت کم نکلتی ہے۔ مولانا کی تحریروں میں صرف چند ہی مثالیں ایسی ملیں گی۔ جب کبھی محض استقرارِ حق کی بناء پر مولانا نے قلم کا یہ حربہ استعمال کیا ہے تو ایسے مواقع پر ہم نے دیکھا ہے

کہ تلوار کی دھار اور اس نیزہ کی نوک بہت تیز ہوتی ہے۔ اب تو مولانا نے اپنے مزاج کے اس رنگ کو مغلوب کرلیا ہے ورنہ الہلال کے صفحات پر اصلاح ندوہ مسلم یونیورسٹی، مسجد کانپور اور ایسے ہی چند موضوعات پر مولانا اپنا یہ انداز کلام صرف کرچکے ہیں۔ ایک یا دو مختصر حوالے ان اوراق کے پڑھنے والوں کو مولانا کے ادب کے اس پہلو سے بھی واقف کردیں گے۔

پہلی جنگ یورپ کے بعد ترکوں کی سلطنت کے متعلق جس وقت برطانوی حکومت اس امر پر زور دے رہی تھی کہ ترک یورپین مقبوضات سے دستبردار ہوجائیں اور لائیڈ جارج یونانیوں سے سازش کرکے اُن پر حملے کرانے کی تدبیریں کررہا تھا تو ہر طرف سے برطانوی سیاست کے ناقوس اخباروں میں اس منصوبہ کی تائید کررہے تھے۔ اس سلسلہ میں آغا خان کا ایک مکتوب بھی اخباروں میں شائع ہوا تھا۔ اُس پر مولانا نے الہلال میں جو تبصرہ کیا تھا اُس کا عنوان (بشنو از نے چوں حکایت می کند!) تھا۔ آغا خان پر اُن کی تنقید کا طنز ایک لطیفہ ادبی ہے۔ فرماتے ہیں کہ :-

> شارحین مثنوی کا اتفاق ہے کہ "نے" سے مقصود یہاں وجود انسانی ہے۔ اور نے سازِ نغمہ سرائے ازل کہ (الانسان سری وانا سرہ ـــ انسان میرا بھید ہے اور میں اُس کا بھید ہوں) وہ ایک آلہ معطل کی طرح دست الٰہی میں ہے: (یقلبہا کیف یشاء) جس طرف

چاہتا ہے اُس کا دل پھیر دیتا ہے ۔ جو آواز اُس نے
سے نکلتی ہے ظاہر بیں سمجھتے ہیں کہ نے کی آواز ہے
لیکن حقیقت شناسان باطنی کو صاف نظر آجاتا ہے
کہ نے کی نہیں بلکہ بجانے والے کی سامعہ نوازی ہے ۔
بانس کے ایک ٹکڑے میں یہ طاقت کہاں کہ ہنگامۂ موسیقی
سے اقلیم جان کو تہ و بالا کر دے ۔ . . . .

. . . . اس ہفتہ ہز ہائی نس آغاخان
باتقابہ الکثیرہ نے مسلمانان ہند کے نام ایک چٹھی بمبئی ٹائمز
میں شائع فرمائی ہے اور اُس کا خلاصہ بذریعہ تار کے
کے اُسی دن تمام اخبارات کو بہ اہتمام مخصوص بھیجا گیا
ہے ۔ یہ چٹھی نہایت دلچسپ ہے اور اس قابل ہے کہ مندرجہ
صدر معارف باطنیہ کو پیش نظر رکھکر اُس کی اِسٹڈی کی
جائے ۔ چٹھی کا آغاز ترکوں کی دل سوزانہ ہمدردی سے مگر
خاتمہ ایک ہمدردانہ مشورہ پر کیا گیا ہے ۔ وہ اس کو بہت
ضروری سمجھتے ہیں کہ مجروحین و مہاجرین کے لئے روپیہ
دیا جائے لیکن اس پر خشمگیں ہیں کہ مسلمانان ہند اجرائے جنگ
کے لئے ترکی کو کیوں مشورہ دیتے ہیں ۔ اُن کو کسی کی
جنگ و صلح سے کیا غرض ! " اپنی حکومت " کی امن بخشی
سے شاد کام رہیں ۔ ترکی کے لئے تو صلح ہی میں بہتری ہے ،

آخر میں اُن کا مشورہ ہے کہ اسلام کو اب اپنے یوریین مقبوضات سے فوراً جلاوطن ہو جانا چاہیئے۔ صرف ایشیا ہی پر قناعت کرنی چاہیئے ایسا کرنے سے ایک نعمت گراں مایہ یعنی "دولت علیہ برطانیہ" کی سرپرستانہ اعانت اور اسلام نوازانہ مہر و نوازش کی دولت لازوال حاصل ہو گی۔ . . . . یہ ایک بانسری کی نئی "حکایت" یا گریموفون کا نغمہ تازہ ہے جو نہائیں کے ساز وجود سے منتقل ہو کر سامعہ نواز بزم و انجمن ہوا ہے۔

اس کتاب کے ابتدائی باب میں بتایا جاچکا ہے کہ مسلم یونیورسٹی کے قائم کرنے کی تجویز جس وقت زیر غور تھی اور حکومت نے اس کے لئے چند شرائط مقرر کر دی تھیں اور "زعمائے ملت" یہ چاہتے تھے کہ حکومت کی شرائط کو قبول کر لیا جائے تو لکھنؤ میں فاؤنڈیشن کمیٹی کا ایک جلسہ منعقد ہوا اور اُس جلسہ کی روئیداد پر "حدیث الغاشیہ" کے عنوان سے مولانا نے تین قسطوں میں ایک اداریہ لکھا۔ اس میں مولانا محمد علی کے طرز عمل پر بھی سخت تنقید کی گئی تھی اور ان سازشوں کی پردہ دری بھی کی گئی تھی جو مہاراجہ محمود آباد کی زیر قیادت حصول مقصد کے لئے کی جا رہی تھیں۔ یہ "سازش" مولانا کے طعن و طنز کی زد میں آئی۔ اُنہوں نے لکھا کہ:۔

پس یہ ایک شرک جلی تھا جو ایک کھُلی بت پرستی کی شکل میں تمام پیروان توحید پر مسلط ہو گیا۔ ہر شخص

جو (علی گڈھ کو) چندہ دینے کے لئے روپیہ رکھتا ہو، ہر شخص جس کے پاس علم کے بجائے چاندی سونا ہو، ہر دولتمند جو کسی اجتماع کے موقعہ پر ایک پُر تکلف ڈنر دے سکتا ہو ہر رئیس جس کے پاس سازشوں کے لئے بہت سی موٹر کاریں ہوں ہر قیمتی پوشاک جس کی جیب بھاری ہو، ہر آواز جس کے گرد ایک حلقہ تحسین ہو، غرضیکہ ہر وہ شے جس کا وزن بھاری اور رنگ سنہری ہو اس امر کا قدرتی حق رکھتی ہے کہ سات کروڑ انسانوں کا اپنے تئیں معبود و مسجود ظاہر کرے اور قومی رائے، آزادی خیال، حق و صداقت، علم وفضل، تجربہ و دانشمندی غرضیکہ دنیا کی ہر شریف قوت سے اپنے آگے سجدہ کرائیے، اُس کی راہیں حکم ہوں، اُس کا حکم شریعت ہو اور اُس کی شریعت غیر منسوخ!

آگے چلکر فرماتے ہیں کہ:-

"استنے میں خبر اُڑی کہ ہزآنز کے ہاں ڈنر ہے۔ ہم نے کہا انا للہ وانا الیہ راجعون۔ قومی طاقت کے ہزاروں ہنی حربے ایک طرف اور ان نقری چیری کانٹوں کی جھنکار ایکطرف! حریت پسندوں سے پوچھا کہ کہئیے اس ناوک کا بھی کوئی جواب آپ کے ترکش میں ہے؟

جواب ملا: نہیں، شکست کا اعتراف ہے۔

چشم اگر ایں است و ابرو ایں و ناز و عشوہ ایں

الفراق اے ہوش و تقویٰ الفراق اے ہوش و دیں

لیکن پھر ہم نے دل کو تسلی دی کہ اطبائے قدیم و جدید کا اتفاق ہے کہ ۶ گھنٹے کے بعد غذا کے جرم سے معدہ خالی ہو جاتا ہے۔ جلد رات کو نہیں بلکہ صبح ۸ بجے سے ــــ اور انگریزی کھانا بوجہ سادہ اور بے آمیز ہونے کے قدرتی طور پر زود ہضم ہوتا ہے۔ اب ایسی بھی یہ غذائے نفیس کیا ثقیل ہو گئی کہ صبح تک معدے میں فروکش رہے اور آوازیں نکلیں تو حلق کی جگہ معدوں سے۔

مگر افسوس کہ دوسرے دن ہماری طبی معلومات میں ایک انقلاب عظیم واقع ہوا طبی کانفرنس کے آئندہ اجلاس میں ہم اس مسئلہ کو پیش کریں گے۔ ہمیں اب یقین ہے کہ غذا جس قدر نفیس و لطیف ہوتی ہے اتنی ہی زیادہ ثقیل بھی ہوتی ہے! نیز اگر بقراط بھی کہیں تو ہم اُن سے اس بارے میں لڑنے کو تیار ہیں کہ شام کی غذا کم از کم دوسرے دن کی دوپہر تک تو ضرور معدے میں موجود رہتی ہے!

حریت الناستیہ" کی تیسری قسط میں مولانا نے فاؤنڈیشن کمیٹی کے جلسہ پر جو بے پناہ تبصرہ کیا ہے وہ اگر طویل نہ ہوتا تو سارا کا سارا نقل کردینے کے قابل تھا۔ اس اداریہ کا ایک جزو ابتدائی باب میں نقل کیا جاچکا ہے۔ بہرحال اُس کے چند اجزا تو اپنی ادبی حیثیت سے ایسے ہیں کہ اس باب میں بھی سما سکتے ہیں۔ اس موقعہ پر مسلمان احرار کی جماعت نے قدیم قیادت کا جو مقابلہ کیا اس کی نفسیات کا اس طرح تجزیہ فرماتے ہیں:۔

مرغ اسیر کی گرفتاری اور صیاد بے مہر کی تغافل شعاری کا مرثیہ ہمارے شعراء کی بدولت ایک دلچسپ داستان بن گئی ہے۔ فرض کیجئے کہ کوئی قیمتی چڑیا آپ نے ہزاروں آرزوؤں اور تمناؤں سے پکڑی ہو اور اس کا مضغۂ ضعیف آپ کی مضبوط مٹھی میں اس طرح دبا ہوا ہو کہ ذرا انگلیوں کو اور سخت کیجئے تو غریب کی کاغذی پسلیاں ریزہ ریزہ ہو جائیں۔

لیکن یکایک آپ کو ایک ٹھوکر لگی اور اب جو آپ دیکھتے ہیں تو ہاتھ خالی ہے اور وہ صید ستم سامنے کسی درخت کی بلند ٹہنی پر بے فکر و بے پرواہ بیٹھا ہوا چہچہا رہا ہے، گویا اس طرح آپ کو چیلنج دے رہا ہے کہ صیادی کا دعویٰ ہے تو یہاں آکر گرفتار کیجئے۔ آپ حسرت سے دیکھتے ہیں، اور انقلاب حالت پر خونناب ہیں۔ اللہ اللہ۔ اب

سے چند لمحے پہلے جو مشت و پر و بال اپنی زندگی اور موت
کے سلئے ہمارے رحم کا محتاج تھا اب ہماری بے بسی و
لاچاری پر اپنی آزادانہ پر افشانیوں سے طعنہ زن ہے!
بعینہ یہی حال فاؤنڈیشن کمیٹی کے پہلے اجلاس
کا تھا۔ وہ صیادان سخت پنجہ جنہوں نے قومی آزادی اور
جماعتی رائے کی چڑیا کو برسوں اپنی آہنی انگلیوں میں دباکر
مقید کر رکھا تھا اور استبداد گرفت کا یہ حال تھا کہ اُف
کرنے کی بھی اجازت نہ تھی اب چشم تر اور نگاہ خونبار
سے دیکھ رہے تھے کہ ایک ہی جست برق رفتار میں
اُن کے قبضہ سے نکل گئی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

پھر اُن سازشوں کا ذکر فرماتے ہیں جو اس بگڑے ہوئے کھیل کو بنانے کی
پس پردہ ہو رہی تھیں :۔

راویاں صداقت شعار اور ناقدان عدالت آثار روایت
کرتے ہیں کہ یہ عمل ساڑھے بارہ بجے تک بجمیع شرائط جاری
رہا۔

اور جو کچھ کہ ہوا قابل اظہار نہیں!
"تسخیر کواکب" کے عمل کی مشکلات آپ کو یا ہم کو کیا معلوم؟
اُن سے پوچھیئے جنہوں نے اس فن کے علم و عمل دونوں
میں دستگاہیں حاصل کی ہیں۔ پھر مقصد جیسا اہم ہوتا ہے

اتنا ہی عمل بھی قوی ہوتا ہے۔ اس عمل میں بڑی مشکل یہ تھی کہ "قرآن السعدین" نہیں بلکہ "قرآن الضدین" کا سامان کرنا تھا۔ مریخ اور زہرہ دونوں کو جمع کرنا تھا اور مشتری کے گرد حلقہ کھینچنا تھا تاکہ زحل کے فرمان سے باہر قدم نہ نکالے۔ بہرحال عامل کا پنجہ سخت تھا مریخ اور زہرہ دونوں کو ایک دائرے میں جمع کر کے ہی چھوڑا یہاں تک کہ "زہرہ" سے بہ ایں ہمہ ناز و عشوہ وعدہ لے لیا گیا کہ عین حضرت مریخ کے برج کے سامنے اپنا رقص ہوش افگن نظارگیان ارضی کو دکھلائے گی۔

اُس زمانہ کی تاریخ سے جو لوگ واقف ہیں وہ زہرہ اور مریخ اور زحل کے اشاروں کو بہ آسانی سمجھ سکتے ہیں اور بعد میں اسی مضمون میں خود **مولانا** ہی نے اپنے اشاروں کے پردے ہٹا دیئے ہیں۔

اصل یہ ہے کہ اجلاس میں بعض زبان آوران آزادی نے سرگرم تقریریں کی تھیں۔ اُن کی نسبت لیڈروں نے پہلے ہی سمجھ لیا تھا کہ ابھی ان سنہرے ٹکڑوں کے لئے آگ کی آزمائش باقی ہے۔ ۱۶ر دسمبر کے جلسہ میں جبکہ زبانوں سے شعلے نکل رہے تھے تو راجہ صاحب محمود آباد ہمارے مجلس طراز دوست مسٹر محمد علی کو مخاطب کر کے دل ہی دل میں ضرور کہتے ہوں گے کہ

مجلس طرازیوں کے مکھا دوں گا سب مزے !
تم اتفاق سے کہیں تنہا اگر ملے

. . . .

مولانا کی طنز نگاری کا یہ ایک شاہکار ہے جو اس قسم کے دوسرے تمام مضامین میں ممتاز ہے۔ ندوۃ العلماء کے متعلق بھی اپنی بعض تحریروں میں مولانا نے یہ رنگ اختیار کیا ہے۔ مثلاً مسئلہ بقاو اصلاح" کے عنوان سے ندوۃ کے ارباب کار پر تنقید فرماتے ہیں۔

ایک نواب صاحب کے یہاں مجلس طرب منعقد تھی اور شہر کی ایک نستعلیق اور بذلہ سنج طوائف مجرا کر رہی تھی۔ جلسہ میں ایک مقدس صورت مولوی صاحب بھی کہیں سے آنکلے تھے۔ کبھی کبھی ایسے ایسے اتفاقات حسنہ بھی پیش آجایا کرتے ہیں! ابھی کل کی بات ہے کہ دارالعلوم ندوہ کے سابق مکان میں فتنہ گرانِ بازاری کا اجتماع ہوا تھا اور مقدس ناظم صاحب ندوہ معہ حلقہ مصاحبین و طلبائے مدرسہ کے رونق افروز تھے۔ شاید اس لئے کہ دو چار سبق اس مدرسہ کے بھی گاہ گاہ ہو جایا کریں تو خشکی دماغ اور یبوست طبع کے لئے اچھا نسخہ ہے۔

. . . .

بہرحال مجلس طرب گرم تھی۔ طوائف گاتے گاتے ایک
پُرمعاملہ شعر پر پہنچی اور اُس کے بتانے کے لئے کسی قدر
بے پردہ اور زہد شکن اشارات سے کام لینا پڑا۔
بھلا مولانا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فرض
مقدس سے کیونکر غفلت کرتے! واعظانہ اور مفتیانہ
فتویٰ دیا کہ یہ حرکت بالکل شرع کے خلاف ہے!
طوائف نے ہاتھ باندھ کر عرض کیا کہ قبلہ وکعبہ! اگر
یہ شرع کے خلاف ہے تو اور جو کچھ ہو رہا ہے یہی
کون مستحب اور سنت ہے!

یہی حال اس جلسہ انتظامیہ کا بھی تھا جو ۲۶ کو لکھنؤ
میں کرایہ کے ممبروں سے بھرا گیا تھا۔

ایک مولانا صاحب **مولانا** کی تنقید کا اس طرح ہدف بنتے ہیں:۔

مولوی صاحب کا اولین وصف امتیازی جو تمام جنس
علماء میں ان کیلئے بمنزلہ فصل کے ہے یہ ہے کہ وہ دولتمند
ہیں . . . . ندوۃ کی نظامت کے وہ ایسے
عاشق زار ہیں کہ برسوں سے اُس کے فراق میں
مضطر و بیقرار ہو رہے ہیں اور بارہا حاشیہ نشینان
بارگاہ کے آگے آہ وزاری کر چکے ہیں کہ خدارا اور
نہیں تو صرف ایک ہی رات کے لئے اس شاہد بے پرواکو

میرے حوالہ کر دو کہ برسوں کی دبی ہوئی حسرتوں کے لئے
ایک شب خلوت بھی بہت ہے!

ایک ہی بوسہ پر لڑائی حیف!
دس نہیں سو نہیں ہزار نہیں

جیسا کہ گزشتہ صفحات میں بتایا جا چکا ہے (مولانا کے طنز کا یہ رنگ چند ہی مضامین تک محدود رہا اور ۱۳ء اور ۱۴ء کے بعد اس رنگ کا کوئی مضمون نظر سے نہیں گذرا) غالباً زندگی کے انتہائی سنجیدہ مشاغل اور صحافت کے مباحث سے علیحدگی اور خود اپنی طبیعت کے اضمحلال نے اب مولانا کے قلم کی نوک میں طنز کی خلش کو کم کر دیا ہے تاہم اُن کے ادب کا یہ نمک بالکل مفقود بھی نہیں ہوا ہے۔ غبار خاطر کے صفحات پر کہیں کہیں یہ رنگ اب بھی جھلکتا ہے گو کہ وہ اب بہت مدھم ہے۔

قصہ مختصر، اردو ادب میں یہ جو کچھ سرمایہ مولانا کے قلم نے جمع کیا ہے وہ معیاری ہے، باقی رہنے والا ہے اور سدا بہار ہے۔ اگر اردو زبان اس ملک میں باقی رہی (اور مجھے تو یقین ہے باقی رہے گی) تو صدیوں بعد بھی جب ہماری کتنی ہی نسلیں اپنی طبعی منزلوں سے گذر کر فنا ہو چکی ہوں گی مولانا کی فکر و نظر کے شاہکار اپنے مقام پر باقی رہیں گے۔ بعد میں آنے والے اہل قلم جب اپنے قلم کو اپنے خیالات کا ترجمان بنائیں گے تو مولانا کے قائم کئے ہوئے معیار ہی کو جانچیں گے

اور اگر اُردو زبان فنا بھی ہو جائے تو دُنیا کی دُوسری زبانیں اس لٹریچر کو اپنے لئے متاع عزیز بنائیں گی اور ہر عہد کی ادبیات کا فاضل جب ہندستان کے ادب کا تحقیقاتی مطالعہ کرے گا تو یہ ناممکن ہے کہ اس ملک کی ذہنی زندگی اور آزادی کی جد و جہد میں **مولانا** کے ادب نے جو حصہ لیا ہے اُسے نظر انداز کر سکے ۔

ع غ

٭

کتبہ: س ۔ ا ۔ نظامی ۱۹۴۹ء